اگست ۱۹۶۶ء

جلد ۶۵ — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

کشف المحجوب

تالیف۔ حضرت علی ہجویریؒ معروف بہ داتا گنج بخش

علمِ تصوّف پر ایک عظیم کتاب

- صوفیائے سابقین کے حالات۔
- مختلف مکاتبِ صوفیاء کے معمولات اور ان کا فرق۔
- علمِ تصوّف کی حقیقت اور اس کے اُصول۔
- تزکیہ و تربیتِ نفس کے لیے ایک بلند پایہ کتاب۔

ترجمہ و تہذیب۔ میاں طفیل محمّد

(امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان)

- اعلیٰ کتابت و طباعت۔ ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۴۰۰
- اعلیٰ ایڈیشن -/۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۶/۷۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ٦٥	اگست ١٩٦٦ء	عدد ٦

چندہ سالانہ
سات روپے

ماہنامہ ترجمان القرآن
٥-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور

قیمت فی پرچہ
٧٥ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

چند روز ہوئے ایک اخبار میں بڑی دردانگیز تصویر نظر سے گزری۔ ویٹ نام کی ایک غریب مفلوک الحال اور بدنصیب عورت اپنے لختِ جگر کی لاش کو، جو امریکی بمباری کا شکار ہو چکا تھا، گود میں لیے اس طرح آہ وزاری کرتی دکھائی دے رہی تھی کہ انسان کا دل دہل جاتا تھا۔ یہ ایک تصویر نہیں بلکہ اس قسم کے سینکڑوں الم ناک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بپھری ہوئی جارحیت معصوم انسانوں کے ساتھ بڑا ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کر رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کے خلاف خصوصاً کمزور اور دکھی انسانوں کے خلاف، بے بس اور مجبور انسانوں کے خلاف طاقتور قومیں ایک شرمناک سازش کر رہی ہیں۔

اس تصویر میں معصوم بچے کی لاش انسانیت سے یہ خاموش سوال کر رہی ہے کہ آخر اسے کس جرم کی پاداش میں ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ اُس کے اندر تو ابھی یہ شعور ہی پیدا نہیں ہوا کہ وہ رنگ ونسل، زبان اور وطن کے اعتبار سے انسانوں کے درمیان تفریق کر سکے۔ وہ ابھی دشمنی اور نفرت کے احساسات سے یکسر نا آشنا ہے۔ پھر وہ ابھی اتنا کمزور اور ناتواں ہے کہ کسی کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ انسانیت کے ایک ایسے کمزور اور ناتواں فرزند کے خلاف یہ ستمگری اُن لوگوں کو کس طرح زیب دیتی ہے جو تہذیب وشائستگی کے دعویدار ہیں۔ اس قسم کے وحشتناک

مظالم سے تو درندے بھی اپنا دامن آلودہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

پھر یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو یہ ستم رانیاں اور بربادیاں ہیں مگر دوسری طرف انسانی جان و مال اور عزت و احترام کے تحفظ اور انسانی حقوق کی پاسبانی کے بڑے بلند بانگ دعوے ہیں۔ اگر وحشیانہ بمباری کرنے والے چند سفید فام ہوا باز گرفتار ہو جائیں تو فوراً انسانیت کے نام پر اپیلیں ہونے لگتی ہیں اور احترام آدمیت کے احساسات ابھرنے لگتے ہیں۔ اگر کشمیر کے مسلمان تباہ و برباد ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے، اگر فلسطین کے عربوں کو اپنے وطن سے نکال کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اگر الجزائر میں انسانی خون سے ہولی کھیلی جائے۔ اگر افریقہ کی مختلف آبادیوں کو تہس نہس کرنے کے لیے مختلف منصوبے بنائے جائیں اور اگر امریکہ کے سیاہ فاموں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے ——— اور انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ستایا جائے، تو ان سفید فام قوموں کے جذبۂ رحم میں کوئی معمولی تحریک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب کسی طاقتور ملک کے چند ہوا باز جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بے گناہوں کی بربادی کے ذمہ دار ہوں، گرفتار ہو جائیں تو سفید فام لوگوں کی انسانیت بیدار ہو جاتی ہے۔ اگر کسی فرد یا قوم کی مظلومیت ہی دل کے تاروں کے اندر ارتعاش پیدا کر سکتی ہے تو پھر یہ ارتعاش گورے اور کالے، ایشیائی، افریقی امریکی کی تفریق کے بغیر ہر ستم زدہ اور مظلوم کے دکھ درد کو دیکھ کر پیدا ہونا چاہیے۔ ایک انسان اگر اپنے پہلو میں پتھر کے بجائے دل رکھتا ہے اور اس نے تنگ نظری اور تعصب کی زہر آلود اور گھٹی ہوئی فضا میں مسلسل رہ کر اپنے دل کو مردہ نہیں بنا لیا تو وہ لازمی طور پر انسانیت کے ہر فرد کے ساتھ محبت کرے گا اور اس کے مصائب اُسے بے چین کر دیں گے۔

دورِ جدید میں انسانی جذبہ و احساس کا ایک اور المناک پہلو یہ ہے کہ مادی مصالح اور مفادات کی پرستش نے دنیا کی تمام قوموں سے حق گوئی اور عدل و انصاف کا جوہر چھین لیا ہے۔ ان اقوام کے احساسات اگر کسی کے دکھ پر بیدار بھی ہونگے تو صرف اسی وقت جب ان کے مفادات پر کوئی آنچ نہ آتی ہو۔ اس اندھی مفاد پرستی نے ان قوموں کو بالکل بے اصول بنا دیا ہے۔ آج ہی اگر ایک دلفگار واقعہ پر کچھ افراد یا قومیں برہم ہونگی اور اُسے انسانیت کی تذلیل قرار دے رہی ہونگی تو دوسرے ہی لمحے وہ خود بڑے اطمینانِ قلب کے ساتھ ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کریں گی جن کے سامنے یہ واقعہ کوئی حیثیت نہ رکھتا ہوگا۔ اب انہیں اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں کے سارے وعظ یکسر بھول جائیں گے۔ امریکہ اور رُوس کو دیکھیے کہ ایک طرف تو یہ دونوں ممالک انسانی آزادی اور اقوام کے حق خود اختیاری اور دنیا میں عدل و انصاف کی حکمرانی کے علمبردار بنتے ہیں لیکن جب عالم واقعات میں ان ممالک کی کارروائیاں سامنے آتی ہیں تو انسان حیران ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ بقائمی ہوش و حواس کیا جا رہا ہے۔ یا ان کے نزدیک پُوری دنیا دیوانوں کی بستی ہے جہاں جو کچھ کیا جائے اُس پر کوئی سوچ بچار یا غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ ہم کتنے عرصہ سے انگریزوں، فرانسیسیوں، جرمنوں، امریکنوں، روسیوں اور ہندوستانیوں کی زبان سے احترامِ انسانیت کا مقدس پرچار سُن رہے ہیں۔ پبلک جلسوں، ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبارات کے ذریعہ سے بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ آزادی اور انصاف انسان کے پیدائشی حقوق ہیں کسی فرد یا قوم کو انہیں پامال نہ کرنے دیا جائے گا لیکن یہ قومیں جن کے یہ مواعظ سُن سُن کر ہمارے کان پک گئے ہیں میدانِ عمل میں بڑی ظالم اور سفاک ثابت ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے معاشی استحصال، انسانی حقوق کی پامالی، جبر و استبداد اور زبردست آزاری میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے اور ان اقوام میں سے کسی ایک نے بھی اپنے دیئے ہوئے اخلاقی درس میں سے کسی ایک حصّہ کو بھی دل و دماغ میں محفوظ نہ رکھا۔ کشمیر کے عوام جب حق خود ارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندو امپیریلزم اُن کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیتا ہے اور یہ وعظ و نصیحت

کرنے والی قومیں اس سارے خونی ڈرامے کو بڑی خاموشی کے ساتھ دیکھتی ہیں اور ظالم کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہتیں کیونکہ ہندوستان سے اُن کے کچھ مصالح اور مفادات وابستہ ہیں۔ اب ویٹ نام میں جب بے گناہوں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے تو روس ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں امریکہ کی کامیابی درحقیقت چین کی حوصلہ شکنی اور بربادی ہے جس سے ان دونوں ممالک کو ایشیا میں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے مواقع میسّر آجائیں گے اور لوٹ کھسوٹ کی راہ میں کوئی قوت مزاحم نہ ہو سکے گی۔ روس ہو یا امریکہ، برطانیہ ہو یا فرانس، ہندوستان ہو یا جاپان، دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں جو قومی مفادات سے بلند ہو کر خالص انسانی نقطۂ نظر سے اپنی کوئی پالیسی متعین کر سکے۔

ان پُرآشوب حالات میں انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج دنیا میں کوئی قوم ایسی ہے جو مادی سُود و زیاں کے چکر سے نکل کر خالص انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے سوچ رہی ہو کیا کوئی قوم ایسی ہے جس کے نزدیک دوستی اور دشمنی کا معیار ذاتی مفادات نہیں بلکہ محض حق ہو، کیا کوئی قوم آج اس مقدس عزم کے ساتھ زندہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر خدائے واحد کی غلامی اختیار کرنے کا درس دے، دنیا کی تنگی سے نجات دلا کر حیاتِ اخروی کی وسعت و کشائش کی راہ دکھائے، ظلم و استبداد سے بچا کر عدل و انصاف کی فضا میں لائے، انسان اور انسان کے درمیان وطن نسل اور رنگ کی بنیاد پر جو تفریق قائم ہو چکی ہے اُسے مٹا کر انسانیت کے مختلف طبقوں کے مابین اخوت اور محبت کے مضبوط رشتے قائم کرے۔ سفاکی اور زبردست آزاری جو دورِ جدید میں طاقتور قوموں کے پسندیدہ مشاغل ہیں انہیں ختم کر کے اُن کی جگہ حق اور انصاف کی بالادستی منوائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج دکھوں سے ستائی ہوئی انسانیت اور زخموں سے چور آدمیت کسی ایسی قوم کی راہ تک رہی ہے جو اسے رُوحانی اطمینان، قلبی سکون اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی

تحفظ عطا کر سکے لیکن اُسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے اور کہیں بھی ان مقدس عزائم کی علمبردار قوم کا نام و نشان نہیں ملتا۔ کبھی ایک ملک سے آواز آتی ہے کہ جمہوری نظام کو اپنا کر دیکھو۔ یہی تمہارے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ دنیا کی ستم زدہ قومیں روشنی کی تلاش میں جمہوری ممالک کی طرف رجوع کرتی ہیں لیکن وہ جب ظاہری چمک دمک کے پیچھے چھپی ہوئی تاریکیاں دیکھتی ہیں تو انہیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ انہیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ جس نعمت کو یہ لوگ آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس سے ایک مخصوص طبقہ ہی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ ملک کی عظیم اکثریت اس سے بہرہ مند نہیں ہوتی۔ ملکی قانون اسی طبقے کے حقوق و مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے بنا ہے اور کمزور اور بے بس طبقوں کے لیے دستوری دفعات بندھنوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہوری ممالک کے یہ حوصلہ شکن حالات دیکھ کر دنیا کی پسی ہوئی اور ستائی قومیں پھر اپنی فلاح و کامرانی کے لیے اشتراکی ممالک کی طرف دیکھتی ہیں لیکن وہاں جا کر اُن پر یہ اندوہناک راز کھلتا ہے کہ غریبوں کی اس نمائشی جنت میں وہ سب ظلم و استبداد ہو رہا ہے جس کے لیے سرمایہ داری کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔ یہاں بھی اقتدار کی ایک نہ مٹنے والی ہوس فکر و عمل کا محرک ہے۔ یہاں بھی قوت کے نشے میں کمزوروں پر ہر طرح کے مظالم کیے جاتے ہیں، یہاں بھی استعماری عزائم کے ساتھ بے بس قوموں کی آزادی سلب کرنے کے مختلف منصوبے بنتے ہیں۔ انسانی آزادی، بنیادی حقوق اور قوموں کے حقوق خود اختیاری کی حیثیت کھوکھلے نعروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اشتراکی ممالک کے برسر اقتدار طبقے اپنی خارجی اور داخلی پالیسی میں اُسی بے اصولی، اُسی سنگدلی اور اُسی مفاد پرستی کا ثبوت دیتے ہیں جو ہمیں سرمایہ دارانہ ممالک کے طرزِ عمل میں نظر آتی ہے۔ اخلاقی اعتبار سے دونوں نظامہائے حیات کے علمبردار ممالک کا دیوالہ نکل چکا ہے اور اُن کے اندر اخلاق کی کوئی رمق باقی نہیں رہی جس سے دوسری قومیں مصیبت ذدہ بے بسی کے عالم میں اُن پر بھروسہ کر سکیں۔ انسانیت آج گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بڑے ہیجانی

کرب و اضطراب کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے۔ اُسے دُور دُور تک کہیں بھی روشنی کے کوئی نشانات نظر نہیں آتے۔ وہ آج زبانِ حال سے اُس قوم کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اس دنیا کی تاریک فضا کو روشنی میں بدل دے، جو مضطرب انسانیت کو سکون کی نعمت سے مالامال کرے، جو بھولی بھٹکی آدمیت کو ہدایت کی راہ دکھائے۔

اس قوم کا وجود فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے جس طرح انسان ہوا، پانی اور دوسرے وسائلِ رزق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح وہ اخلاقی اور روحانی خلا میں بھی دیر تک زندگی نہیں گزار سکتا۔ انسانیت کی فلاح کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی ضرور ہو جس کے پیشِ نظر بجز بھلائی اور نیکی پھیلانے اور برائی اور منکر کو مٹانے کے کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران - ۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران ۱۱۰)

دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں بھلائی کے فروغ اور برائی کے استیصال کا اہم فریضہ تمہارے یعنی امتِ مسلمہ کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ اب اس امت کا ہر فرد توحید کا امانت دار ہے۔ زمین میں باری تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ قانونِ الٰہی کے نفاذ و تحفظ کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے،

دنیا کے نظامِ عدل کو برقرار رکھنا اُس کے بنیادی فرائض میں داخل ہے اس امت کی زندگی اور اس کے ہر فرد کا مشن یہی ہے کہ دنیا میں حق و انصاف کی عملداری قائم کرے اور باطل کی ہر صورت کو مٹانے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

بعض دوسرے مقامات پر اس امت کے فرائض کی تصریح کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امتِ وسط"
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا - (البقرہ-۱۴۳)	رسول تم پر گواہ ہو۔

تمہیں ایک ایسی امت بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے غایتِ اعتدال پر ہو۔ ہر کجی، اور ہر افراط و تفریط سے یکسر پاک۔ حدیثِ نبوی میں وسط کی تفسیر عدل سے آئی ہے اور ائمہ لغت سے بھی یہی منقول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس دنیا میں صرف عدل و انصاف کے چاہنے والے ہی نہیں بلکہ اس کے علمبردار بھی ہو۔ دنیا کی مظلوم قوموں کی داد رسی تمہیں کرنا ہے اور پھر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسول کو تمہارے افکار و اعمال کے لیے مثال اور نمونہ بنایا گیا ہے اسی طرح تم دنیا کی ہر امت کے لیے نمونہ اور معیار ہو اور تم پر اجتماعی حیثیت سے وہی نازک ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو نبی اور رسول پر باری تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جاتی ہے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا رسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے اسی طرح امتِ مسلمہ کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے اور ادائے شہادت کے اس اہم فرض کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں پورے انہماک، پورے جذبۂ ایثار، للہیت، بے نفسی اور تدبر کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔ پھر تمہیں اس امر کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ شہادتِ حق کا یہ فریضہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد تھا۔ اس ایک غرض کے علاوہ اُن کی

کوئی دوسری غرض نہ تھی۔ وہ اسی مقصد کے حصول کے لیے دنیا میں بھیجے گئے، اسی کے لیے ساری عمر ہمت آزما رہے، گھروں سے نکالے گئے، دشمنوں سے ستائے گئے۔ ائمۃ الکفر کے ظلم و استبداد کا نشانہ بنے پھر اسی مشن کی خدمت کرتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان مقدس ہستیوں کو دیکھ کر امتِ وسط کے ہر فرد کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ادائے شہادت کا یہ فریضہ کوئی ثانوی کام نہیں بلکہ اس امت کے وجود کا بنیادی مقصد ہے۔ اُسے دنیا کی قوموں پر اسی لیے گواہ ٹھیرایا ہے کہ انہیں اسے دیکھ کر یہ معلوم ہو سکے کہ خدا ترسی کس چیز کا نام ہے، عدل و انصاف کے کیا عملی مضمرات ہیں۔ حق پرستی کے کیا کیا تقاضے ہیں۔ اگر یہ امت خدا کی عدالت میں یہ شہادت نہ دے سکے کہ اس نے وہ ہدایت جو اُس کے رسول کے ذریعہ اُس تک پہنچی تھی اُس کے بندوں تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی، تو وہ ناکام و نامراد ہوگی۔ اس کی دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا راز شہادتِ حق کے صحیح طور پر ادا کرنے میں مضمر ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ حج میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (۷۸)	اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم ہی رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ

امتِ وسط اور شہید علی الناس کے علاوہ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو "قوامین بالقسط" بننے کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ سورۃ النساء میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا	اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو خواہ اس کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ

تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۱۳۵)

خواہ مالدار ہو یا غریب۔ بہر حال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو تہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

قسط کے معنی بھی انصاف کے ہیں یعنی اے اہلِ ایمان تم اس دنیا میں صرف حق پرست، منصف مزاج اور عدل و انصاف کے طلبگار ہی نہیں بلکہ حق و انصاف کے محافظ اور علمبردار بھی ہو۔ اور تمہاری گواہی اپنی کسی ذاتی خواہش، ذوق یا ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی خالص رضا جوئی کے لیے ہے۔ جو مقدس کام تم مالک الملک کی خوشنودی اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کر رہے ہو، اس میں سو فیصد بے لوثی اور خلوص ہونا چاہیے۔ اس فرض کو ادا کرتے ہوئے تمہیں ذاتی فوائد اور مصالح، قرابت داری اور دوستی کا لحاظ نہ رکھنا چاہیے کیونکہ باری تعالیٰ کی خوشنودی، عزیزوں اور رشتہ داروں، دوستوں اور ہم نشینوں کی خوشنودی سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ایک آدمی جب ایمان باللہ کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اب اس کے نزدیک اصل مقصد مالک و خالق کی رضا جوئی ہے۔ باقی رہی مخلوق کی خوشنودی تو وہ مالک کی رضا کے تابع ہے۔ کسی فرد، قبیلہ یا خاندان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے باری تعالیٰ کو ناراض نہیں کیا جا سکتا۔

آپ اگر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قومی، خاندانی اور انفرادی سطح پر جو چیز ہمیں حق و انصاف سے بار بار ہٹاتی ہے، وہ قومی اور ملکی مصالح، ذاتی نقصانات، خاندانی رنجشیں اور دوستوں کی ناراضگی کا خوف ہوتا ہے۔ محولہ بالا آیات میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے بعد تو انسان کو مفادات کے سارے

بُت توڑ دینے چاہییں اور اپنی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کے سارے صنم کدے خود اپنے ہاتھ سے مسمار کر دینے چاہییں۔ وہ دل ایمان کے نور سے منور نہیں ہو سکتا جس میں اللہ اور رسولؐ کی محبت باقی سارے رشتوں پر غالب نہیں آتی۔ ایک انسان جب تک لا کی ضرب سے قوم اور وطن، خاندان، اور نسل کے مختلف بتوں کو پاش پاش نہیں کر دیتا اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں اللہ کی غلامی اختیار نہیں کر سکتا۔ بندگی صرف ایک ہی رب کی ہو سکتی ہے خواہ وہ اللہ رب العلمین ہو یا وطن، قوم، برادری کے دوسرے آلہہ جو انسان نے خود بنا رکھے ہیں اگر اہل ایمان بھی ان جھوٹے خداؤں کو پوجتے رہیں تو دنیا میں حق و انصاف کا کس طرح بول بالا ہو گا۔ اس کے تسلط اور فرمانروائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کم از کم وہ لوگ تو ان کی پرستش سے باز رہیں جو باری تعالیٰ کی بندگی کے دعویدار ہیں۔ آج دنیا کی طاقتور قومیں حقائق کو جانتے ہوئے ہر لمحہ حق و انصاف کا خون کرتی رہتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی گواہی دینے والی نہیں بلکہ اپنے مفادات کی غلام ہیں انہیں دنیاوی مصالح سچائی اور انصاف سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ قومی اور وطنی سطح سے نیچے آ کر جب ہم خاندانی سطح پر حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں وہاں بھی یہی خوفناک مرض لاحق نظر آتا ہے۔ ہم حق و انصاف کی بات کرنے سے محض اس لیے پرہیز کرتے ہیں کہ اس سے ہمارے خاندان اور ہماری برادری کے چند افراد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ پھر اس سے نیچے آ کر ہم اپنے ذاتی مفادات کی خاطر بڑی بے تکلفی سے سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ صداقت کی اس راہ میں انسان کو جو جو موانع پیش آتے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے قرآن مجید اس امر کی تلقین کرتا ہے کہ تم سب سے پہلے اپنے ذہن میں یہ احساس پیدا کرو کہ تم اللہ کے گواہ ہو اور اس طرح مجاہدۂ نفس کے ذریعہ ضرورت پڑنے پر خود اپنے خلاف گواہی دینے کی ہمت اور حوصلہ پیدا کرو۔ انسان کے لیے سب سے مشکل اور صبر آزما کام خود اپنے احساسات و جذبات اور خود اپنے میلانات و رجحانات کے خلاف کسی چیز کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ عقل یوں بھی بڑی حیلہ جُو ہے۔ کسی دلپسند چیز کے حق

میں مختلف تاویلات کرنے میں بڑی چابکدستی کا ثبوت دیتی) ہے۔ پھر خاص طور پر جب حق کے فیصلے کی زد براہِ راست انسان کے ذاتی احساسات اور مفادات پر پڑ رہی ہو تو "عقلِ عیار" کے جوہر خوب کھلتے ہیں اور وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے اُسے جادۂ مستقیم سے ہٹا کر غلط راہ پر ڈال دیتی ہے، اپنی ذات کے علاوہ انسان کو اپنے والدین اور دوسرے اقارب کے مفادات عزیز ہوتے ہیں اور اُن کے جذبات کی پاسداری میں وہ حق کا خون کرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر قرآن مجید نے انسان کی جس فطری کمزوری کی نشاندہی کی ہے اس کا تعلق اُس کی اپنی ذات اور خاندان سے ہے۔ ایک دوسرے مقام پر باری تعالیٰ نے نہایت واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ حق و انصاف کی جس روش کو تمہیں اپنی انفرادی اور خاندانی زندگی میں اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہی روش تمہیں اپنی قومی اور اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کرنی چاہیے اور بین الاقوامی معاملات میں تمہیں اُسی حق پرستی کا ثبوت دینا چاہیے جو ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ جس طرح نفس پرستی، خاندان پرستی اور خدا پرستی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح قوم پرستی اور حق پرستی کو بھی یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ ظلم و ناانصافی ہر صورت میں مذموم فعل ہے خواہ اس کا ارتکاب انفرادی زندگی میں کیا جائے یا قومی اور اجتماعی زندگی میں کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے بڑی صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔ (المائدہ - ۸)	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر حق و صداقت پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے ہٹ جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہاری کارکردگی

سے پوری طرح باخبر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ معاملات میں بے انصافی کے سبب عموماً دو ہی ہوتے ہیں یا تو کسی فریق کی رعایت اور مروت اور اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت اور پاسبانی یا کسی فریق کی عداوت و مخالفت۔ سورۃ النساء میں اقامتِ عدل کا حکم سبب اول کی مناسبت سے ہے یعنی اپنے جذبات کی رعایت، اپنے والدین اور اقربا کی رعایت اور مروّت، یا کسی طاقتور کا خوف و مرعوبیت یا کسی کمزور اور ناتواں سے بے جا ہمدردی کی وجہ سے انسان جادۂ مستقیم سے ہٹ کر ایک غلط روش اختیار کر لیتا ہے یہاں اس دوسری آیت میں بے انصافی کا سبب کسی فریق کی دشمنی اور مخالفت ہے۔ یہ آزمائش بھی بڑی سخت اور شدید ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنی ذات اور برادری کے لیے اکثر اوقات حق کا دامن چھوڑ دیتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلے وہ آتے ہیں جب وہ بزعم باطل اپنی قوم اور وطن کے ناموس، اور اس کی سربلندی اور اقبالمندی کی خاطر اور مخالف اقوام کو ذلیل و خوار کرنے اور نیچا دکھانے کی غرض سے حق اور انصاف کا خون کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ یہ سب کچھ اپنی ذات اور برادری کے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم اور وطن کے لیے کرتا ہے اور اس سے اُس کی غرض کچھ ذاتی مفادات کا حصول نہیں ہوتا بلکہ قوم کے دشمنوں کو زک پہنچانا ہوتا ہے اس لیے وہ اس ناپاک کام کو ایک پاکیزہ اور مقدس فعل سمجھ کر سرانجام دیتا ہے بلکہ اسے ایک بہت بڑی قومی خدمت سمجھتے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

پھر یہ مرحلہ ایک اور اعتبار سے بھی بڑا نازک ہے۔ انفرادی زندگی کے فیصلوں میں خارجی دباؤ نسبتاً کم اثر انداز ہوتا ہے۔ انسان کا ضمیر بڑی آزادی کے ساتھ اُس کے کسی اقدام کے بارے میں اُسے باخبر کر دیتا ہے اور اُسے جلد ہی اپنے کسی قول اور فعل کی اخلاقی قدر و قیمت کا احساس ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس جتنا کوئی فیصلہ یا اقدام اجتماعی نوعیت

کا ہو اور اس کا تعلق کسی فرد کے ضمیر کے بجائے قوم کے شعور سے ہوتا ہے اس پر عوامی نفسیات
(MOB PSYCHOLOGY) زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔
اجتماعی زندگی کا تند و تیز دھارا انفرادی احساس کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے اور اس دباؤ کے تحت انسان کے لیے حق و باطل کی تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب معاملہ کسی قوم کی دشمنی اور مخالفت کا ہو تو وہاں صرف وہی لوگ اعتدال سے کام لے سکتے ہیں جن کے قلوب پر سوائے اللہ کے خوف کے کسی دوسرے کا خوف طاری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمن اقوام اور گروہوں کے معاملے میں انصاف سے کام لینے کی تلقین کے ساتھ ساتھ انہیں مالک الملک سے ڈرنے کی بھی ہدایت فرمائی ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا قانون ہے جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں تک کے حقوق کی یہ رعایت رکھی ہے کہ اشتعال میں بھی دشمنوں اور خون کے پیاسوں تک سے انصاف کیا جائے۔ کافر اقوام کا کفر بھی انہیں عدل و انصاف کے بنیادی حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ قومی زندگی میں یہ مرحلہ کوئی آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معاونت اور دستگیری، اس پر غیر متزلزل ایمان اور اس کی ہمہ بینی اور ہمہ دانی کا استحضار ہی اسے آسان بنا سکتا ہے۔ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف موقعوں پر حق و انصاف کی راہ پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔
حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا کہ ہم عسر و یسر دونوں حالتوں میں آپ کے احکام کو دل و جان سے بجا لائیں گے، اپنے امراء سے، جب تک کہ ان میں کھلا ہوا کفر نہ پائیں جنگ و جدال سے اجتناب کریں گے اور ہر قسم کے حالات میں حق اور انصاف کی بات کہیں گے اور اس راہ میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے مرعوب اور خوفزدہ نہ ہوں گے۔

قرآن مجید میں وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ کا جو حکم صادر فرمایا گیا ہے وہ صرف اشیاء کو تولنے تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندۂ مومن کو ہمیشہ ہر حال میں اور زندگی کے ہر معاملے میں خواہ اس کا تعلق کسی شعبۂ حیات سے ہو، دیانت، امانت اور صداقت کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ اگر دنیا میں خدا کے بندوں نے بھی میزانِ عدل قائم نہ کی تو پھر اس ذمہ داری کو کون اٹھائے گا۔ انصاف کائنات کی بنیادی حقیقت ہے اور اسی پر اس کا سارا نظام چل رہا ہے اور اگر یہ ختم ہو گیا تو نہ صرف انسان بلکہ حیوانات، نباتات اور جمادات کا وجود بھی ناممکن ہو گا۔ ان کی زندگی اور ان کی بقا اور فلاح کا سارا دار و مدار انصاف پر ہے۔ آج دنیا میں جتنی کشمکش برپا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی جس قوم پر حق و انصاف کی عملداری قائم کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی وہ بدقسمتی سے اپنے اس بنیادی فرض سے یکسر غافل ہو کر بیکار کاموں اور فضول مشغلوں میں اپنی قوتیں اور صلاحیتیں کھپا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور حق کی فرمانروائی ہی سے اس کا وجود قائم ہے۔ اُس کی رحمت اس بات کی منتظر ہے کہ کب یہ قوم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے اپنے فرض کو سرانجام دیتی ہے۔ وہ انتہائی متحمل اور بردبار ذات ایک مدت تک تو اس امت کی غفلت کیشی کو گوارا کر سکتی ہے لیکن انسانیت کو عدل و انصاف کی فرمانروائی سے مدت دراز تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ اُس رحیم و کریم ذات کو بہر حال اپنی مخلوق کو حق اور انصاف کی دولت سے نوازنا ہے اور اگر یہ فرض اس امت نے سرانجام نہ دیا تو وہ اس کی جگہ اس مقدس کام کی بجا آوری کے لیے کسی دوسری قوم کو متعین کر دے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ	اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب
إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے
اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيْتُمْ	تو تم زمین سے چمٹ کر رہ جاتے ہو۔ کیا تم

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا
قَلِيْلٌ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ
لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ۔ (التوبہ - ۳۹)

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے
تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کی زندگی کا
سروسامان آخرت کی زندگی کے مقابلے میں
بہت ہی قلیل ہے۔ تم اگر اس کی راہ میں نہ
نکلو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ دردناک سزا دیگا
اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم پیدا کر دیگا
اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ وہ ہر چیز
پر قادر ہے۔

اخبار بین حضرات کی نظر سے وہ انٹرویو گزرا ہوگا جو نیشنل عوامی پارٹی کے صوبائی جنرل سکرٹری جناب غوث بخش بزنجو نے نوائے وقت کے سٹاف رپورٹر ملتان کو حال ہی میں دیا ہے۔ ہمیں صاحب موصوف کے خیالات پڑھ کر مسرت بھی ہوئی ہے اور رنج بھی۔ رنج اس بات کا ہُوا کہ جس خطۂ ارضی کو جان و مال کے ناقابلِ بیان نقصانات برداشت کرکے اسلام کے لیے حاصل کیا گیا تھا اسے بعض لوگ الحاد کی آماجگاہ بنانے کے لیے تُلے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت اس ملک کی عظیم اکثریت کے لیے بڑی اندوہناک ہے لیکن ہماری نظر میں اس بیان کا اچھا پہلو یہ ہے کہ اس میں نیشنل عوامی پارٹی کے ایک ممتاز قائد نے کھل کر اپنی پارٹی کا موقف بیان کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے مقاصد کی وضاحت کر دی ہے۔ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ فرمایا ہے کہ "ہم ملک میں اشتراکیت کو اپنا آخری مقصد سمجھتے ہیں اور اسی میں پاکستان کی فلاح کا راز پاتے ہیں۔ اشتراکیت اور اسلام میں بنیادی فرق ہے اور نیشنل عوامی پارٹی پاکستان میں اس سوشلسٹ نظام کے نفاذ کی داعی ہے جو مارکس اور لینن کا سوشلزم ہے۔ سوشلزم کو اسلامی سوشلزم کے ساتھ ملانے کا نعرہ

(باقی ۷ پر)

تفہیم القرآن

ق

(۲)

اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور اصحاب الرَّس[12]، اور ثمود، اور عاد، اور فرعون[13]، اور لُوط کے

۱۲؎ اس سے پہلے سُورۂ فرقان، آیت ۳۸ میں اصحاب الرّس کا ذکر گزر چکا ہے، اور دوسری مرتبہ اب یہاں ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے، کوئی تفصیل ان کے قصّے کی بیان نہیں کی گئی ہے۔ عرب کی روایات میں الرّس کے نام سے دو مقام معروف ہیں۔ ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں۔ ان میں نجد کا الرّس زیادہ مشہور ہے اور اشعار جاہلیت میں زیادہ تر اُسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ تعیّن کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرّس ان دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے قصّے کی بھی کوئی قابلِ اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحّت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں جس طرح اُن کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں اہلِ عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصّے سے واقف تھے اور بعد میں یہ روایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

۱۳؎ قومِ فرعون کے بجائے صرف فرعون کا نام لیا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوم پر اس طرح مسلّط تھا کہ اس کے مقابلے میں قوم کی کوئی آزادانہ رائے اور عزیمت باقی نہیں رہی تھی۔ جس گمراہی کی طرف وہ جاتا تھا، قوم اس کے پیچھے گھسٹتی چلی جاتی تھی۔ اس بنا پر پوری قوم کی گمراہی کا ذمّہ دار تنہا اُس شخص کو قرار دیا گیا۔ جہاں قوم کے لیے رائے اور عمل کی آزادی موجود ہو وہاں اپنے اعمال کا بوجھ وہ خود

بھائی، اور ایکہ والے، اور تُبَّع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔[۱۵] ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا[۱۶] اور آخر کار میری وعید اُن پر چسپاں ہو گئی۔[۱۷]

اٹھاتی ہے۔ اور جہاں ایک آدمی کی آمریت نے قوم کو بے بس کر رکھا ہو، وہاں وہی ایک آدمی پوری قوم کے گناہوں کا بار اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فردِ واحد پر یہ بوجھ لد جانے کے بعد قوم سبکدوش ہو جاتی ہے۔ نہیں، قوم پر اس صورت میں اِس اخلاقی کمزوری کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اُس نے کیوں اپنے اوپر ایک آدمی کو اس طرح مسلط ہونے دیا۔ اِسی چیز کی طرف سُورۂ زخرف، آیت ۵۴ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔ "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُخْرُف، حاشیہ ۵۰)۔

[۱۵] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۳۷۔ سُورۂ دخان، حاشیہ ۳۲

[۱۶] یعنی انہوں نے اپنے رسولوں کی رسالت کو بھی جھٹلایا اور ان کی دی ہوئی اِس خبر کو بھی جھٹلایا کہ تم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جاؤ گے۔

[۱۷] اگرچہ ہر قوم نے صرف اُس رسول کو جھٹلایا جو اُس کے پاس بھیجا گیا تھا، مگر چونکہ وہ اُس خبر کو جھٹلا رہی تھی جو تمام رسول بالاتفاق پیش کرتے رہے ہیں، اس لیے ایک رسول کو جھٹلانا درحقیقت تمام رسولوں کو جھٹلا دینا تھا۔ علاوہ بریں اِن قوموں میں سے ہر ایک نے محض اپنے ہاں آنے والے رسول ہی کی رسالت کا انکار نہ کیا تھا بلکہ وہ سرے سے یہی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھیں کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آسکتا ہے، اس لیے وہ نفسِ رسالت کی منکر تھیں اور ان میں سے کسی کا جُرم بھی صرف ایک رسول کی تکذیب تک محدود نہ تھا۔

[۱۸] یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ اس سے پہلے کی ۶ آیتوں میں امکانِ آخرت

کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک
۱ع میں پڑے ہوئے ہیں [۱۹] ع

کے دلائل دیئے گئے تھے، اور اب اِن آیات میں عرب اور اس کے گردوپیش کی قوموں کے تاریخی انجام کو اِس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ آخرت کا جو عقیدہ تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے رہے ہیں وہی حقیقت کے عین مطابق ہے، کیونکہ اس کا انکار جس قوم نے بھی کیا وہ شدید اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو کر رہی اور آخر کار خدا کے عذاب نے اس کے وجود سے دنیا کو پاک کیا۔ آخرت کے انکار اور اخلاق کے فساد کا یہ لزوم، جو تاریخ کے دوران میں مسلسل نظر آ رہا ہے، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انسان فی الواقع اس دنیا میں غیر ذمہ دار اور غیر جوابدہ بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ اسے لازماً اپنی مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اسی لیے تو جب کبھی وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر دنیا میں کام کرتا ہے، اس کی پوری زندگی تباہی کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ کسی کام سے اگر پے در پے غلط نتائج برآمد ہوتے چلے جائیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ کام حقیقت سے متصادم ہو رہا ہے۔

[۱۹] یہ آخرت کے حق میں عقلی استدلال ہے۔ جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اِس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اُس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اب یہ امر واقعہ کہ ہم اِس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اِس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا، اور موت دینے کے بعد وہ ہمیں دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے کہ

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں،[۲۰] (اور ہمارے اس براہِ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔[۲۱]

اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔

[۱۹] آخرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے اس آخرت کو مانو یا اس کا انکار کرو، بہر حال اس کو آنا ہے اور یہ ایک ایسا امر واقعہ ہے جو تمہارے انکار کے باوجود پیش آ کر رہے گا۔ انبیاء کی پیشگی تنبیہ کو مان کر اُس وقت کے لیے پہلے سے تیاری کر لو گے تو اپنا بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی اپنی شامت بلاؤ گے۔ تمہارے نہ ماننے سے آخرت آتے آتے رک نہیں جائے گی اور خدا کا قانونِ عدل معطّل نہ ہو جائے گا۔

[۲۰] یعنی ہماری قدرت اور ہمارے علم نے انسان کو اندر اور باہر سے اِس طرح گھیر رکھا ہے کہ اُس کی رگِ گردن بھی اُس سے اُتنی قریب نہیں ہے جتنا ہمارا علم اور ہماری قدرت اس سے قریب ہے۔ اُس کی بات سننے کے لیے ہمیں کہیں سے چل کر نہیں آنا پڑتا، اُس کے دل میں آنے والے خیالات تک کو ہم براہِ راست جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر اسے پکڑنا ہو گا تو ہم کہیں سے آ کر اس کو نہیں پکڑیں گے، وہ جہاں بھی ہے ہر وقت ہماری گرفت میں ہے، جب چاہیں گے اسے دھر لیں گے۔

[۲۱] یعنی ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اس کے خیالات کو جانتے ہیں، دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اس کا کوئی قول و فعل ان کے ریکارڈ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہو گی اُس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہو گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اس پر شہادت دینے کے لیے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اُس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لا کر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہو گا، اس کا ٹھیک ٹھیک تصور کرنا تو ہمارے

پھر دیکھو، وہ موت کی جاں کنی حق لے کر آ پہنچی[۲۲]، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا[۲۳]۔ اور پھر صور پھونکا گیا[۲۴]، یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اِس حال میں آ گیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا[۲۵]۔ اِس

لیے مشکل ہے۔ مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا اور کام کرتا ہے اُس میں ہر طرف اُس کی آوازیں، اُس کی تصویریں اور اس کی حرکات و سکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں اور ان میں سے ہر چیز کو بعینہٖ انہی شکلوں اور آوازوں میں دوبارہ اِس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرہ برابر فرق نہ ہو۔ انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے فرشتے نہ ان آلات کے محتاج ہیں نہ اِن قیود سے مقید۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز اُن کی ٹیپ اور اُن کی فلم ہے جس پر وہ ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جُوں کی تُوں ثبت کر سکتے ہیں اور قیامت کے روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اُس کی اپنی آوازیں اُس کی وہ باتیں سنوا سکتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتا تھا، اور اس کی اپنی آنکھوں سے اس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دے دیگا بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اسی لیے دنیا میں ہر شخص کے اقوال و افعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے تاکہ اس کی کارگزاریوں کا پورا ثبوت ناقابلِ انکار شہادتوں سے فراہم ہو جائے۔

[۲۲] حق لے کر آ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ موت کی جاں کنی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے وہ حقیقت کھلنی شروع ہو جاتی ہے جس پر دنیا کی زندگی میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ اِس مقام سے آدمی وہ دوسرا عالم صاف دیکھنے لگتا ہے جس کی خبر انبیاء علیہم السلام نے دی تھی۔ یہاں آدمی کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آخرت بالکل برحق ہے، اور یہ حقیقت بھی اس کو معلوم ہو جاتی ہے کہ زندگی کے اِس دوسرے مرحلے

چیز کی طرف سے تُو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔^۲۶^ اُس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے۔^۲۷^

میں وہ نیک بخت کی حیثیت سے داخل ہو رہا ہے یا بدبخت کی حیثیت سے۔

۲۳ یعنی یہ وہی حقیقت ہے جس کو ماننے سے تو کنّی کتراتا تھا۔ تو چاہتا تھا کہ دنیا میں بے نتھے بیل کی طرح چھوٹا پھرے اور مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں تجھے اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ اسی لیے آخرت کے تصوّر سے تو دُور بھاگتا تھا اور کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ کبھی یہ عالَم بھی برپا ہونا ہے۔ اب دیکھ لے، یہ وہی دوسرا عالَم تیرے سامنے آ رہا ہے۔

۲۴ اس سے مراد وہ نفخِ صور ہے جس کے ساتھ ہی تمام مرے ہوئے لوگ دوبارہ حیاتِ جسمانی پا کر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۵۲۔ جلد دوم، ص ۴۹۳۔ جلد سوم، ص ۱۲۲-۱۹۹-۶۰۶۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۴۷۔

۲۵ اغلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہی دو فرشتے ہیں جو دنیا میں اُس شخص کے قول و عمل کا ریکارڈ مرتب کرنے کے لیے مامور رہے تھے۔ قیامت کے روز جب صور کی آواز بلند ہوتے ہی ہر انسان اپنے مرقد سے اٹھے گا تو فوراً وہ دونوں فرشتے آ کر اسے اپنے چارج میں لے لیں گے۔ ایک اسے عدالت گاہ خداوندی کی طرف ہانکتا ہوا لے چلے گا اور دوسرا اس کا نامۂ اعمال ساتھ لیے ہوئے ہو گا۔

۲۶ یعنی اب تو تجھے خوب نظر آ رہا ہے کہ وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جس کی خبر خدا کے نبی تجھے دیتے تھے۔

۲۷ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے آیت نمبر ۲۱ میں "گواہی دینے والا" فرمایا گیا ہے، وہ کہے گا کہ یہ اس شخص کا نامۂ اعمال میرے پاس تیار ہے۔ کچھ دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہوا تھا، وہ عرض کرے گا کہ یہ شخص جس کو میں نے اپنے قابو میں کر کے جہنم کے لیے تیار کیا تھا اب آپ کی خدمت

حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں[۲۸] ہر کٹے کافر[۲۹] کو جو حق سے عناد رکھتا تھا، خیر کو روکنے والا[۳۰] اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا[۳۱]، شک میں پڑا ہوا تھا[۳۲] اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ڈال دو اسے سخت عذاب میں[۳۳]۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا "خداوندا،

میں حاضر ہے۔ مگر سیاق و سباق سے زیادہ مناسبت رکھنے والی تفسیر وہ ہے جو قتادہ اور ابنِ زید سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ساتھی سے مراد ہانک کر لانے والا فرشتہ ہے اور وہی عدالتِ الٰہی میں پہنچ کر عرض کرے گا کہ یہ شخص جو میری سپردگی میں تھا سرکار کی پیشی میں حاضر ہے۔

۲۸؎ اصل الفاظ ہیں اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ "پھینک دو جہنم میں تم دونوں" سلسلۂ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ حکم اُن دونوں فرشتوں کو دیا جائے گا جنہوں نے مرقد سے اٹھتے ہی مجرم کو گرفتار کیا تھا اور لا کر عدالت میں حاضر کر دیا تھا۔

۲۹؎ اصل میں لفظ "کَفَّار" استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک، سخت ناشکرا۔ دوسرے سخت منکرِ حق۔

۳۰؎ خیر کا لفظ عربی زبان میں مال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بھلائی کے لیے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے کسی کا حق ادا نہ کرتا تھا، نہ خدا کا نہ بندوں کا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ وہ بھلائی کے راستے سے خود ہی رُک جانے پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ دنیا میں خیر کے لیے سدِّ راہ بنا ہوا تھا۔ اپنی ساری قوتیں اس کام میں صرف کر رہا تھا کہ نیکی کسی طرح پھیلنے نہ پائے۔

۳۱؎ یعنی اپنے ہر کام میں اخلاق کی حدیں توڑ دینے والا تھا۔ اپنے مفاد اور اپنی اغراض اور خواہشات کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔ حرام طریقوں سے مال سمیٹتا اور حرام راستوں میں صرف کرتا تھا۔ لوگوں کے حقوق پر دست درازیاں کرتا تھا۔ نہ اس کی زبان کسی حد کی پابند تھی نہ اس کے ہاتھ کسی ظلم اور زیادتی سے رکتے تھے۔ بھلائی کے راستے میں صرف رکاوٹیں ڈالنے ہی پر بس نہ کرتا تھا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بھلائی اختیار کرنے والوں کو ستاتا تھا اور بھلائی کے لیے کام کرنے والوں

میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا" جواب ستم ڈھاتا تھا۔

۳۲؎ اصل میں لفظ "مُرِیب" استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک، شک کرنے والا۔ دوسرے، شک میں ڈالنے والا۔ اور دونوں ہی معنی یہاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود شک میں پڑا ہوا تھا اور دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالتا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ اور آخرت اور ملائکہ اور رسالت اور وحی، غرض دین کی سب صداقتیں مشکوک تھیں۔ حق کی جو بات بھی انبیاء کی طرف سے پیش کی جاتی تھی، اُس کے خیال میں وہ قابلِ یقین نہ تھی۔ اور یہی بیماری وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو لگاتا پھرتا تھا۔ جس شخص سے بھی اس کو سابقہ پیش آتا اُس کے دل میں وہ کوئی نہ کوئی شک اور کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتا۔

۳۳؎ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات گن کر بتا دی ہیں جو انسان کو جہنم کا مستحق بنانے والی ہیں: (۱) انکارِ حق، (۲) خدا کی ناشکری، (۳) حق اور اہلِ حق سے عناد، (۴) بھلائی کے راستے میں سدِّ راہ بننا، (۵) اپنے مال سے خدا اور بندوں کے حقوق ادا نہ کرنا، (۶) اپنے معاملات میں حدود سے تجاوز کرنا، (۷) لوگوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنا، (۸) دین کی صداقتوں پر شک کرنا، (۹) دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالنا، اور (۱۰) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدائی میں شریک ٹھیرانا۔

۳۴؎ یہاں فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور یہ بات بھی اندازِ بیان ہی سے مترشح ہوتی ہے کہ وہ شخص اور اُس کا شیطان، دونوں خدا کی عدالت میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حضور، یہ ظالم میرے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اسی نے آخرکار مجھے گمراہ کر کے چھوڑا، اس لیے سزا اس کو ملنی چاہیے۔ اور شیطان جواب میں کہتا ہے کہ سرکار، میرا اس پر کوئی زور تو نہیں تھا کہ یہ سرکش نہ بننا چاہتا ہو اور میں نے زبردستی اس کو سرکش بنا دیا ہو۔ یہ کم بخت تو خود نیکی سے نفور اور بدی پر فریفتہ تھا۔ اسی لیے انبیاء کی کوئی بات اِسے پسند نہ آئی اور میری ترغیبات پر یہ پھسلتا چلا گیا۔

میں ارشاد ہوا "میرے حضور جھگڑا نہ کرو، میں تم کو پہلے ہی انجامِ بد سے خبردار کر چکا تھا[۳۵]
میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی[۳۶] اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں[۳۷]"۔ ع ۲
وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہیگی کیا اور کچھ ہے[۳۸]؟

۳۵؎ یعنی تم دونوں ہی کو میں نے متنبہ کر دیا تھا کہ تم میں سے جو بہکائے گا وہ کیا سزا پائے گا اور جو بہکے گا اُسے کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میری اس تنبیہ کے باوجود جب تم دونوں اپنے اپنے حصے کا جرم کرنے سے باز نہ آئے تو اب جھگڑا کرنے سے حاصل کیا ہے بہکنے والے کو بہکنے کی اور بہکانے والے کو بہکانے کی سزا تو اب لازماً ملنی ہی ہے۔

۳۶؎ یعنی فیصلے بدلنے کا دستور میرے ہاں نہیں ہے تم کو جہنم میں پھینک دینے کا جو حکم میں دے چکا ہوں وہ اب واپس نہیں لیا جا سکتا۔ اور نہ اُس قانون ہی کو بدلا جا سکتا ہے جس کا اعلان میں نے دنیا میں کر دیا تھا کہ گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے کی کیا سزا آخرت میں دی جائیگی۔

۳۷؎ اصل میں لفظ "ظَلّام" استعمال ہوا ہے جس کے معنی بہت بڑے ظالم کے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے بندوں کے حق میں ظالم تو ہوں مگر بہت بڑا ظالم نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں خالق اور رب ہو کر اپنی ہی پروردہ مخلوق پر ظلم کروں تو بہت بڑا ظالم ہونگا۔ اس لیے میں سرے سے کوئی ظلم بھی اپنے بندوں پر نہیں کرتا۔ یہ سزا جو میں تم کو دے رہا ہوں یہ ٹھیک ٹھیک وہی سزا ہے جس کا مستحق تم نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے۔ تمہارے استحقاق سے رتی بھر بھی زیادہ سزا تمہیں نہیں دی جا رہی ہے۔ میری عدالت بے لاگ انصاف کی عدالت ہے۔ یہاں کوئی شخص کوئی ایسی سزا نہیں پا سکتا جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو۔ اور جس کے لیے اس کا استحقاق بالکل یقینی شہادتوں سے ثابت نہ کر دیا گیا ہو۔

۳۸؎ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "میرے اندر اب مزید آدمیوں کی گنجائش نہیں ہے"۔ دوسرے یہ کہ "اور جتنے مجرم بھی ہیں انہیں لے آئیے"۔ پہلا مطلب لیا جائے تو اس ارشاد سے تصوّر یہ سامنے آتا ہے کہ مجرموں کو جہنم میں اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہے

اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہوگی۔[۳۹] ارشاد ہوگا "یہ ہے

کہ اس میں ایک سوئی کی بھی گنجائش نہیں رہی، حتیٰ کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو بھر گئی تو وہ گھبرا کر چیخ اٹھی کہ کیا ابھی اور آدمی بھی آنے باقی ہیں؟ دوسرا مطلب لیا جائے تو یہ تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جہنم کا غیض اس وقت مجرموں پر کچھ اس بُری طرح بھڑکا ہوا ہے کہ وہ ہل من مزید کا مطالبہ کیے جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ آج کوئی مجرم اس سے چھوٹنے نہ پائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہنم سے اللہ تعالیٰ کے اس خطاب اور اس کے جواب کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ محض مجازی کلام ہے؟ یا فی الواقع جہنم کوئی ذی روح اور ناطق چیز ہے جسے مخاطب کیا جا سکتا ہو اور وہ بات کا جواب دے سکتی ہو؟ اس معاملہ میں درحقیقت کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مجازی کلام ہو اور محض صورتِ حال کا نقشہ کھینچنے کے لیے جہنم کی کیفیت کو سوال و جواب کی شکل میں بیان کیا گیا ہو، جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے موٹر سے پوچھا تو چلتی کیوں نہیں، اس نے جواب دیا: میرے اندر پٹرول نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل ممکن ہے کہ یہ کلام مبنی برحقیقت ہو۔ اس لیے کہ دنیا کی جو چیزیں ہمارے لیے جامد و صامت ہیں ان کے متعلق ہمارا یہ گمان کرنا درست نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ویسی ہی جامد و صامت ہوں گی۔ خالق اپنی ہر مخلوق سے کلام کر سکتا ہے اور اس کی ہر مخلوق اس کے کلام کا جواب دے سکتی ہے خواہ ہمارے لیے اس کی زبان کتنی ہی ناقابلِ فہم ہو۔

۳۹ یعنی جونہی کہ کسی شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ کی عدالت سے یہ فیصلہ ہوگا کہ وہ متقی اور جنت کا مستحق ہے، فی الفور وہ جنت کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اسے کوئی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی کہ پاؤں سے چل کر یا کسی سواری میں بیٹھ کر سفر کرتا ہوا وہاں جائے اور فیصلے کے وقت اور دخولِ جنت کے درمیان کوئی وقفہ ہو۔ بلکہ اِدھر فیصلہ ہوا اور اُدھر متقی جنت میں داخل ہو گیا۔ گویا وہ جنت میں پہنچایا نہیں گیا ہے بلکہ خود جنت ہی اٹھا کر اس کے پاس لے آئی گئی ہے۔ اس سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالمِ آخرت میں زمان و مکان کے تصورات ہماری اس دنیا کے تصورات

وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا[۳۰] اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا[۳۱]، جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا[۳۲]، اور جو دلِ گرویدہ لیے ہوتے

سے کس قدر مختلف ہوں گے۔ جلدی اور دیر اور دُوری اور نزدیکی کے وہ سارے مفہومات وہاں بے معنی ہو جائیں گے جن سے ہم اس دنیا میں واقف ہیں۔

۳۰؎ اصل میں لفظ 'اَوّاب' استعمال ہُوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس نے نافرمانی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کا راستہ چھوڑ کر طاعت اور اللہ کی رضا جوئی کا راستہ اختیار کر لیا ہو، جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہے، اور اُس چیز کو اختیار کر لے جو اللہ کو پسند ہے، جو راہِ بندگی سے ذرا قدم ہٹتے ہی گھبرا اٹھے اور توبہ کر کے بندگی کی راہ پر پلٹ آئے، جو کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

۳۱؎ اصل میں لفظ "حَفِیظ" استعمال ہُوا ہے جس کے معنی ہیں "حفاظت کرنے والا"، اور اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اللہ کے حدود اور اس کے فرائض اور اس کی حُرمتوں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتوں کی حفاظت کرے، جو اُن حقوق کی نگہداشت کرے جو اللہ کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں، جو اُس عہد و پیمان کی نگہداشت کرے جو ایمان لا کر اُس نے اپنے رب سے کیا ہے، جو اپنے اوقات اور اپنی قوتوں اور محنتوں اور کوششوں کی پاسبانی کرے کہ ان میں سے کوئی چیز غلط کاموں میں ضائع نہ ہو، جو توبہ کر کے اس کی حفاظت کرے اور اسے پھر نہ ٹوٹنے دے۔

۳۲؎ یعنی باوجود اس کے کہ رحمان اُس کو کہیں نظر نہ آتا تھا، اور اپنے حواس سے کسی طرح بھی وہ اس کو محسوس نہ کر سکتا تھا، پھر بھی وہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس کے دل پر دوسری محسوس طاقتوں اور علانیہ نظر آنے والی زور آور ہستیوں کے خوف کی بہ نسبت اُس اَن دیکھے رحمان کا خوف زیادہ غالب تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رحمٰن ہے، اس کی رحمت کے بھروسے پر وہ گناہ گار نہیں بنا بلکہ ہمیشہ اس کی ناراضی سے ڈرتا ہی رہا۔ اس طرح یہ آیت مومن کی دو اہم اور بنیادی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ محسوس نہ ہونے اور نظر نہ آنے کے باوجود خدا سے ڈرتا

آیا ہے۔ "داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ" وہ دن حیاتِ ابدی کا دن ہوگا۔

ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خدا کی صفتِ رحمت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود گناہوں پر جری نہیں ہوتا۔ یہی دو خوبیاں اسے اللہ کے ہاں قدر کا مستحق بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت میں ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے امام رازی نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ عربی زبان میں ڈر کے لیے خوف اور خشیت دو لفظ استعمال ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں ایک باریک فرق ہے۔ خوف کا لفظ بالعموم اُس ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی طاقت کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کے احساس کی بنا پر آدمی کے دل میں پیدا ہو۔ اور خشیت اُس ہیبت کے لیے بولتے ہیں جو کسی کی عظمت کے تصور سے آدمی کے دل پر طاری ہو۔ یہاں خوف کے بجائے خشیت کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے دل میں اللہ کا ڈر محض اس کی سزا کے خوف ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ کی عظمت و بزرگی کا احساس اُس پر ہر وقت ایک ہیبت طاری کیے رکھتا ہے۔

۴۳؎ اصل الفاظ ہیں "قلبِ مُنیب" لے کر آیا ہے۔ مُنیب انابت سے ہے جس کے معنی ایک طرف رُخ کرنے اور بار بار اُسی کی طرف پلٹنے کے ہیں۔ جیسے قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب ہی کی طرف رُخ کیے رہتی ہے اور آپ خواہ کتنا ہی ہلائیں جُلائیں، وہ ہر پھر کر پھر قطب ہی کی سمت میں آجاتی ہے۔ پس قلبِ مُنیب سے مراد ایسا دل ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک اللہ کی طرف مُڑ گیا اور پھر زندگی بھر جو احوال بھی اُس پر گزرے ان میں وہ بار بار اسی کی طرف پلٹتا رہا۔ اسی مفہوم کو ہم نے دلِ گرویدہ کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں اصلی قدر اُس شخص کی ہے جو محض زبان سے نہیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ سچے دل سے اُسی کا ہو کر رہ جائے۔

۴۴؎ اصل الفاظ ہیں اُدْخُلُوْھَا بِسَلَامٍ۔ سلام کو اگر سلامتی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے رنج اور غم اور فکر اور آفات سے محفوظ ہو کر اس جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور اگر اسے سلام ہی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آؤ اس جنت میں اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے تم کو سلام ہے۔

وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے[۴۵]۔

ہم اِن سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے چھان مارا تھا[۴۶]۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے[۴۷]؟ اِس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجّہ سے بات کو سُنے[۴۸]۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات بتادی ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص جنت کا مستحق ہوتا ہے، اور وہ ہیں (۱) تقویٰ، (۲) رجوع الی اللہ، (۳) اللہ سے اپنے تعلق کی نگہداشت۔ (۴) اللہ کو دیکھے بغیر اور اس کی رحیمی پر یقین رکھنے کے باوجود اس سے ڈرنا، اور (۵) قلبِ مُنیب لیے ہوئے اللہ کے ہاں پہنچنا، یعنی مرتے دم تک انابت کی روش پر قائم رہنا۔

[۴۵] یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی، مگر اس پر مزید ہم اُنہیں وہ کچھ بھی دیں گے جس کا کوئی تصور تک ان کے ذہن میں نہیں آیا ہے کہ وہ اس کے حاصل کرنے کی خواہش کریں۔

[۴۶] یعنی صرف اپنے ملک ہی میں وہ زور آور نہ تھیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہ جا گھُسی تھیں اور ان کی تاخت کا سلسلہ روئے زمین پر دُور دُور تک پہنچا ہُوا تھا۔

[۴۷] یعنی جب خدا کی طرف سے ان کی پکڑ کا وقت آیا تو کیا ان کی وہ طاقت اُن کو بچا سکی؟ اور کیا دنیا میں پھر کہیں ان کو پناہ مل سکی؟ اب آخر تم کس بھروسے پر یہ امید رکھتے ہو کہ خدا کے مقابلے میں بغاوت کر کے تمہیں کہیں پناہ مل جائے گی؟

[۴۸] بالفاظِ دیگر جو یا تو خود اپنی گرہ کی اتنی عقل رکھتا ہو کہ صحیح بات سوچے، یا نہیں تو غفلت اور تعصب سے اتنا پاک ہو کہ جب دوسرا کوئی شخص اسے حقیقت سمجھائے تو وہ کھلے کانوں سے اس کی بات سنے۔ یہ نہ ہو کہ سمجھانے والے کی آواز کان کے پردے پر سے گزر رہی ہے اور سننے والے کا دماغ کسی اور طرف مشغول ہے۔

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا[۴۹] اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔ پس اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو[۵۰] اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے۔ اور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔[۵۱]

---

۴۹ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰم السجدہ، حواشی نمبر ۱۱ تا ۱۵

۵۰ یعنی امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات ہم نے چھ دن میں بنا ڈالی ہے اور اُس کو بنا کر ہم تھک نہیں گئے ہیں کہ اُس کی تعمیرِ نو کرنا ہمارے بس میں نہ رہا ہو۔ اب اگر یہ نادان لوگ تم سے زندگی بعد موت کی خبر سُن کر تمہارا مذاق اڑاتے ہیں اور تمہیں دیوانہ قرار دیتے ہیں تو اس پر صبر کرو۔ ٹھنڈے دل سے اِن کی ہر بیہودہ بات کو سنو اور جس حقیقت کے بیان کرنے پر تم مامور کیے گئے ہو اسے بیان کرتے چلے جاؤ۔

اِس آیت میں ضمناً ایک لطیف طنز یہود و نصاریٰ پر بھی ہے جن کی بائیبل میں یہ افسانہ گھڑا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا (پیدائش ۲:۲)۔ اگرچہ اب مسیحی پادری اس بات سے شرمانے لگے ہیں اور انہوں نے کتابِ مقدس کے اردو ترجمے میں "آرام کیا" کو "فارغ ہوا" سے بدل دیا ہے، مگر کنگ جیمز کی مستند انگریزی بائیبل میں AND HE RESTED ON THE SEVENTH DAY کے الفاظ صاف موجود ہیں، اور یہی الفاظ اُس ترجمے میں بھی پائے جاتے ہیں جو ۱۹۵۴ء میں یہودیوں نے فلیڈلفیا سے شائع کیا ہے۔ عربی ترجمہ میں بھی فاستراح فی الیوم السابع کے الفاظ ہیں۔

۵۱ یہ ہے وہ ذریعہ جس سے آدمی کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ دعوتِ حق کی راہ میں اُسے خواہ کیسے ہی دل شکن اور رُوح فرسا حالات سے سابقہ پیش آئے، اور اس کی کوششوں کا خواہ کوئی ثمرہ بھی حاصل ہوتا نظر نہ آئے، پھر بھی وہ پورے عزم کے ساتھ زندگی بھر کلمۂ حق بلند کرنے اور دنیا کو خیر کی طرف بلانے کی سعی جاری رکھے۔ رب کی حمد اور اس کی تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے،

اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے "طلوعِ آفتاب سے پہلے" فجر کی نماز ہے "غروب آفتاب سے پہلے" دو نمازیں ہیں ایک ظہر، دوسری عصر۔ "رات کے وقت" مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور تیسری تہجد بھی رات کی تسبیح میں شامل ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم، ص ۶۴۲ تا ۶۴۷۔ جلد سوم ص ۱۳۸-۱۴۰ تا ۱۴۲)۔ رہی وہ تسبیح جو "سجود سے فارغ ہونے کے بعد" کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، تو اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ بھی ہو سکتا ہے اور فرض کے بعد نفل ادا کرنا بھی۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت حسن بن علی، حضرات ابوہریرہ، ابن عباس، شَعْبِی، مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، قَتَادَہ، ابراہیم نَخعی اور اَوزاعِی اس سے مراد نماز مغرب کے بعد کی دو رکعتیں لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص اور ایک روایت کے بموجب حضرت عبداللہ بن عباس کا بھی یہ خیال ہے کہ اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد بھی نوافل ادا کیے جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ مالدار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "کیا ہوا؟"۔ انہوں نے عرض کیا وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے بجز اُن کے جو وہی عمل کریں جو تم کرو گے؟ وہ عمل یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمدللہ، اور اللہ اکبر کہا کرو"۔ کچھ مدت کے بعد اُن لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے مال دار بھائیوں نے بھی یہ بات سن لی ہے اور وہ بھی یہی عمل کرنے لگے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ ایک روایت میں ان کلمات کی تعداد ۳۳-۳۳ کے بجائے دس دس بھی منقول ہوئی ہے۔

حضرت زید بن ثابت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو ہدایت فرمائی تھی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمدللہ کہا کریں اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہیں۔

اور سُنو، جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا، ۵۲

بعد میں ایک انصاری نے عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی کہتا ہے اگر تم ۲۵-۲۵ مرتبہ یہ تین کلمے کہو اور پھر ۲۵ مرتبہ لا الٰہ الا اللّٰہ کہو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا اسی طرح کیا کرو۔ (احمد۔ نسائی۔ دارمی)

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر جب پلٹتے تھے تو میں نے آپ کو یہ الفاظ کہتے سُنا ہے سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (احکام القرآن للجصاص)

اس کے علاوہ بھی ذکر بعد الصلوٰۃ کی متعدد صورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں۔ جو حضرات قرآن مجید کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیں وہ مشکوٰۃ، باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں سے کوئی ذکر جو اُن کے دل کو سب سے زیادہ لگے، چھانٹ کر یاد کر لیں اور اس کا التزام کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بتائے ہوئے ذکر سے بہتر اور کونسا ذکر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خیال رکھیں کہ ذکر سے اصل مقصود چند مخصوص الفاظ کو زبان سے گزار دینا نہیں ہے بلکہ اُن معانی کو ذہن میں تازہ اور مستحکم کرنا ہے جو ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے جو ذکر بھی کیا جائے اس کے معنی اچھی طرح سمجھ لینے چاہییں اور پھر معنی کے استحضار کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے

۵۲؎ یعنی جو شخص جہاں مرا پڑا ہو گا، یا جہاں بھی دنیا میں اس کی موت واقع ہوئی تھی، وہیں خدا کے منادی کی آواز اُس کو پہنچے گی کہ اٹھو اور چلو اپنے رب کی طرف اپنا حساب دینے کے لیے۔ یہ آواز کچھ اس طرح کی ہو گی کہ روئے زمین کے چپے چپے پر جو شخص بھی زندہ ہو کر اٹھے گا وہ محسوس کریگا کہ پکارنے والے نے کہیں قریب ہی سے اس کو پکارا ہے۔ ایک ہی وقت میں پورے کرۂ ارض پر ہر جگہ یہ آواز یکساں سنائی دے گی۔ اس سے بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالم آخرت میں زمان و مکان کے اعتبارات ہماری موجودہ دنیا کی بہ نسبت کس قدر بدلے ہوئے ہونگے اور کیسی قوتیں کس طرح کے قوانین کے مطابق وہاں کارفرما ہونگی۔

جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سُن رہے ہونگے[۵۳] - وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہماری طرف ہی اُس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہونگے - یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے[۵۴]-

۵۳ اصل الفاظ ہیں يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ - اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں- ایک یہ کہ سب لوگ امرِ حق کی پکار کو سُن رہے ہونگے- دوسرے یہ کہ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہونگے- پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ لوگ اُسی امرِ حق کی پکار کو اپنے کانوں سے سُن رہے ہونگے جس کو دنیا میں وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، جس سے انکار کرنے پر انہیں اصرار تھا، اور جس کی خبر دینے والے پیغمبروں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے- دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ آوازۂ حشر سنیں گے، انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی وہم نہیں ہے بلکہ واقعی یہ آوازِ حشر ہی ہے، کوئی شبہ انہیں اس امر میں نہ رہے گا کہ جس حشر کی انہیں خبر دی گئی تھی وہ آگیا ہے اور یہ اُسی کی پکار بلند ہو رہی ہے-

۵۴ یہ جواب ہے کُفار کی اُس بات کا جو آیت نمبر ۳ میں نقل کی گئی ہے- وہ کہتے تھے کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر خاک ہو چکے ہوں اُس وقت ہمیں پھر سے زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جاتے، یہ واپسی تو بعید از عقل و امکان ہے- اُن کی اِسی بات کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ حشر، یعنی سب اگلے پچھلے انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کر لینا ہمارے لیے بالکل آسان ہے- ہمارے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کس شخص کی خاک کہاں پڑی ہے- ہمیں یہ جاننے میں بھی کوئی دقّت نہیں پیش آئے گی کہ ان بکھرے ہوتے ذرات میں سے زید کے ذرات کون سے ہیں اور بکر کے ذرات کون سے- ان سب کو الگ الگ سمیٹ کر ایک ایک آدمی کا جسم پھر سے بنا دینا، اور اُس جسم میں اُسی شخصیت کو از سرِ نَو پیدا کر دینا جو پہلے اس میں رہ چکی تھی، ہمارے لیے کوئی بڑا محنت طلب کام نہیں ہے، بلکہ ہمارے ایک اشارے سے یہ سب کچھ

اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں[۵۵]، اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے[۵۶]۔ ع

آنا فاناً ہو سکتا ہے۔ وہ تمام انسان جو آدم کے وقت سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہیں ہمارے ایک حکم پر بڑی آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں۔ تمہارا چھوٹا سا دماغ اسے بعید سمجھتا ہو تو سمجھا کرے۔ خالقِ کائنات کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔

۵۵ اِس فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی بھی ہے اور کفار کے لیے دھمکی بھی۔ حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں اُن کی قطعاً پروا نہ کرو، ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور ان سے نمٹنا ہمارا کام ہے۔ کفار کو متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نبی پر جو فقرے تم کس رہے ہو وہ تمہیں بہت مہنگے پڑیں گے۔ ہم خود ایک ایک بات سن رہے ہیں اور اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔

۵۶ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جبراً لوگوں سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ بلکہ دراصل یہ بات حضورؐ کو مخاطب کر کے کفار کو سنائی جا رہی ہے۔ گویا ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارا نبی تم پر جبّار بنا کر تو نہیں بھیجا گیا ہے۔ اُس کا کام زبردستی تمہیں مومن بنانا نہیں ہے کہ تم نہ ماننا چاہو اور وہ جبراً تم سے منوائے۔ اس کی ذمہ داری تو بس اتنی ہے کہ جو متنبّہ کرنے سے ہوش میں آجائے اُسے قرآن سُنا کر حقیقت سمجھا دے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو نبی تم سے نہیں نمٹے گا بلکہ ہم تم سے نمٹیں گے۔

اسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیت

عبدالحمید صدیقی

(۲)

اسلام کا دوسرا امتیازی وصف جس نے اس کے ارتقاء کا ایک خاص انداز اور رُخ متعین کیا وہ عقیدہ ختمِ نبوت ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے چونکہ وحی اور الہام کا سلسلہ نبی آخر الزمان پر ختم ہو چکا ہے اس لیے کوئی شخص بھی اب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی کسی بات کو الہامی سمجھ کر بلا چون و چرا قبول کر لیا جائے۔ کوئی صوفی، کوئی عالم اور کوئی حاکم بطور عقیدہ غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ حافظ ابنِ قیمؒ نے اپنی مشہور تصنیف اعلام الموقعین میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور قرآن و سنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر اگر کوئی شخص کسی چیز کی پیروی کرتا ہے تو وہ گمراہی ہے۔ یہاں ہم حافظ صاحب کی تصریحات کی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے ایک نہیں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے کہ حق و صداقت کی راہ وہی ہے جس کی باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نشاندہی کر دی ہے اور جس پر حضور سرورِ دو عالم نے خود چل کر اس کے نشیب و فراز سے پوری انسانیت کو آگاہ فرما دیا ہے۔

ؔ ہماری ساری بحث حافظؒ کی کتاب سے ماخوذ ہے جو حضرات اسے تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہوں وہ اعلام الموقعین جلد اوّل کی فصل "فی تحریم الافتاء فی دین اللہ بالرأی المتضمن لمخالفۃ النصوص والرأی الذی لم تشہد لہ النصوص بالقبول" کی طرف رجوع کریں۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف - ۲)	لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ہدایت و رہنمائی کا واحد سرچشمہ وہ تعلیم ہے جو بنی نوع انسان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے۔ اس ایک منبع کے سوا کسی دوسرے منبع سے افکار و اعمال کے جو دھارے بھی نکلیں ان کی پاکیزگی کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ اُس سرچشمہ سے رواں نہیں ہوتے جو ہر لحاظ سے مامون و محفوظ ہو۔ وہ علم جس کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت نہیں، اس میں باطل کی آمیزش کے سارے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر بڑی تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء: ۵۹)	اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتری ہے۔

اس آیت کی جو تشریح حافظ ابنِ قیم نے کی ہے ہم یہاں اُس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"اَطِيْعُوْا کے لفظ کو جس طرح باری تعالیٰ نے اپنے لیے ارشاد فرمایا ہے اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی اطاعت باری تعالیٰ کی اطاعت کی طرح مستقلاً واجب ہے لیکن اولوالامر کے بارے میں اطیعوا کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقلاً واجب نہیں بلکہ رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ یعنی صاحبِ امر جو حکم حضور سرورِ دوعالم کی متابعت میں دے اُسے بسروچشم تسلیم کیا جائے اور جو حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر دیا جائے اُسے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ حضورؐ نے خود اس ضمن میں نہایت واضح طور پر فرمایا ہے لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔ (کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں)۔ بعض دوسرے مقامات پر یوں ارشاد فرمایا: "انما الطاعۃُ فی المعروف" (اطاعت صرف معروف میں ہے)" فمن امرکم منھم بمعصیۃ اللہ فلا سمع لہ ولا طاعۃ" (اصحابِ امر میں سے جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے تو اس کے معاملے میں نہ سمع ہے اور نہ اطاعت)۔ اس ضمن میں حضور سرورِ کائنات کی وہ حدیث قابلِ غور ہے جس میں حضورؐ نے اُن لوگوں کے حق میں جو اولی الامر کے حکم کی تعمیل میں آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے تھے فرمایا کہ اگر یہ اُس میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔

پھر قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ "اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اُمت کے مختلف افراد کے مابین نیک نیتی کے ساتھ اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف انہیں دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کرتا۔

فان تنازعتم فی شیءٍ میں لفظ شیءٍ کو نکرہ استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اختلاف کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان ساری صورتوں

میں آخری فیصلے کے لیے ایک صاحبِ ایمان اللہ اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی کتاب کو حکم مانا جائے اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرنے سے مراد آپ کی حیات طیبہ میں تو آپ کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع کرنا ہے اور آپ کے بعد آپ کی سنّت سے سند صداقت حاصل کرنا ہے"۔

حافظ ابن قیم نے محوّلہ بالا آیت کی تصریح میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ اولوا الامر اور عام افرادِ امت کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف اگر نیک نیتی پر مبنی ہو تو کسی لحاظ سے بھی قابلِ مذمّت نہیں۔ چونکہ ہر شخص کے سوچنے سمجھنے کا انداز اور صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ سارے افراد کا زندگی کے ہر معاملے میں ایک ہی نقطۂ نگاہ ہو۔ قرآن مجید نے اس اختلاف کو دُور کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ جن حضرات کے درمیان اختلاف رونما ہو جائے وہ آخری فیصلے کے لیے کتاب و سنّت کی عدالت میں اپیل کریں کیونکہ یہ وہ سب سے اونچی عدالت ہے جہاں سے انہیں بالکل بے لاگ فیصلہ مل سکتا ہے۔ مفسرین کرام نے اسی آیت سے اُن لوگوں کے نظریہ کی بھی تردید کی ہے جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمۂ معصومین کا بھی وجود تسلیم کرتے ہیں۔ ہر امام، ہر صاحبِ علم، ہر مفسّر و محدّث، ہر مصلح اور صوفی اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہر حال غیر معصوم ہی ہے اس لیے ان میں سے کسی کی بھی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت اور فرمانبرداری صرف معروف ہی میں صحیح اور درست ہے۔

اسلام کے اس بنیادی تصور نے مسلمانوں کے فکری اور عملی ارتقاء کا ایک ایسا رُخ متعین کیا ہے جو دوسری اقوام سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ انسان نے اصحابِ عقل پر بڑی شد و مد سے تنقید کی، اُن کی آراء سے اختلاف کیا اور جس معاملے میں انہیں کوئی لغزش محسوس ہوئی اس کا برملا اظہار کیا اور اس سارے کام کو پُورے اطمینانِ قلب کے ساتھ

سرانجام دیا لیکن اصحابِ کشف کی ہر بات کو کلامِ الٰہی سمجھ کر فوراً قبول کیا اور ان کے مکاشفات کو وہی اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت دی جو اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت کو دی جاتی ہے۔

ہم یہاں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک صاحبِ عقل کی عقلی تصریحات زیادہ صحیح ہوتی ہیں یا کسی صاحبِ کشف کے مکاشفات۔ عقل کی افادیت اپنی جگہ مسلّم، مگر مذہبی لٹریچر اس بات کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ عقل اپنی ساری کامرانیوں کے باوجود تنہا انسان کی رہنما نہیں بن سکتی۔ یہ انسان کی دوسری صلاحیتوں کی طرح محدود ہے۔ اس پر انسان کے ذاتی رجحانات، اُس کے احساسات اور مفادات کی پرچھائیاں برابر پڑتی رہتی ہیں۔ اس لیے اس کے فیصلوں میں وہ بے لوثی اور انصاف پیدا نہیں ہو سکتا جو کسی صحیح نظامِ اخلاق کے لیے ضروری ہے۔ عقل کے پیروں کو جذبات، تعصبات، زمان و مکان کے اثرات برابر متاثر کرتے رہتے ہیں اس لیے عقل جب تک وحی و الہام کی روشنی میں آگے نہیں بڑھتی اس وقت تک منزلِ مقصود حاصل نہیں کر سکتی اور اگر وہ اس روشنی کے بغیر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو وہ تاریکیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور بسا اوقات پھسل کر نہایت خوفناک اور مہیب غاروں میں جا گرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے اندر وحی و الہام کو ہمیشہ فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے اور عقل کی ساری تصریحات اور توجیہات کی قدر و قیمت کا اندازہ وحی کی میزان پر تول کر کیا جاتا ہے۔ عقل کے معاملے میں اسلام اور دوسرے مذاہب کا نقطۂ نظر قریب قریب ایک ہے لیکن اصحابِ باطن کے مکاشفات کے بارے میں اسلام، دوسرے مذاہب سے ممیّز و ممتاز ہے۔ چونکہ نبوت کا سلسلہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے اس لیے ایک مسلمان از روئے عقیدہ کسی چیز کو بھی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اصحابِ کشف کے باطنی مشاہدات خواہ وہ اُن کے لیے کتنی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں اسی صورت میں قبول کرے گا جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہوں۔ اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے اصحابِ خرد اور اصحابِ کشف کو ایک ہی مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ وہ ان دونوں کے تجربات

سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کے تجربے اور مشاہدے کو وحی اور الہام کی روشنی میں پوری طرح پرکھ کر قبول کرتا ہے۔ ان میں سے جو چیز وہ دینِ حق کے مطابق پاتا ہے اُس کی پذیرائی کرتا ہے۔

اللہ کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو خود اصحابِ کشف نے بھی فیصلہ کُن حیثیت دی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کو بار بار اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اُن کے کسی قول یا فعل کو جب تک وہ اُسے اللہ اور اُس کے رسول کے بتلائے ہوئے معیار پر پُوری طرح پرکھ نہ لیں، قبول نہ کریں کیونکہ اُن کے مشاہدات خواہ کتنے صحیح ہوں لیکن وحی والہام کی طرح سو فیصد لغزش سے محفوظ و مامون نہیں ہو سکتے۔ ان مشاہدات میں بھی انسانی تجربات اور عقلی تصریحات کی طرح مشاہدے کرنے والے کے ذاتی رجحانات اور میلانات اپنا رنگ بھر دیتے ہیں۔ انسان کی محدود صلاحیتوں کے اثرات خواہ وہ عقل کا میدان ہو یا کشف اور مجاہدہ باطن کا، ہر جگہ ظاہر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے صوفیا جنہیں اُئمۂ تصوف کہنا چاہیے انہوں نے بھی اس امر کا پُوری طرح اعتراف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معیارِ حق صرف تعلیماتِ الٰہی اور سنتِ رسول ہے اور اسی کے مطابق ہر تجربے اور مشاہدے کی قدر متعین کرنی چاہیے۔ مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔ مجدد صاحب کے علاوہ شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب[1] میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فتوح الغیب[2] میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف[3] میں اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں نے بلا استثناء اپنے مشاہدات پر شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مسلمان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے ہیں جس میں ایک شخص

---

۱ ۔ ۴۴ ، ص ۴۷-۵۱

۲ ۔ ص ۱۰-۱۴

۳ ۔ ص ۲۳-۲۶

کی امامت یا قیادت ناگزیر ہوتی ہے تو وہ اس فرض کو انجام دینے سے پہلے اس حقیقت کو خود بھی ذہن میں لاتا ہے اور دوسروں کو بھی پورے مجمعے کے سامنے یاد دلاتا ہے کہ حق و صداقت کا معیار صرف اللہ اور اُس کے رسول ہیں۔ اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی میں اُس کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا راز مضمر ہے۔ جمعہ سے بڑھ کر مذہبی اور روحانی اجتماع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس میں امام سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ حق و صداقت کی راہ صرف وہی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے بتائی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فقد رشد ومن يعصهما فانه لا يضر الا نفسه ولا يضر اللّٰه شيئًا۔[1]	جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اُس نے ہدایت پائی اور جو ان کی نافرمانی کرے وہ اپنی جان کو ہی نقصان دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

خلافت ایک ایسا ادارہ ہے جو امورِ دنیا اور امورِ دین دونوں پر حاوی ہے اور اس کا سربراہ مملکت ریاست کے ہر شعبۂ زندگی کا براہِ راست ذمہ دار ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق اخلاق و روحانیت سے ہو، یا معیشت و معاشرت سے، لیکن اپنی ساری بزرگی اور اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوجود وہ اپنی ذات کو یا اپنی خلافت کو ہر خطا سے پاک اور منزہ نہیں سمجھتا اور اس وجہ سے وہ بار بار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ خوب و ناخوب، صحیح اور غلط کا پیمانہ صرف ایک ہی ہے اور وہ باری تعالیٰ اور اُس کے رسول کی اطاعت ہے اس لیے عوام کو اس معیار کے ساتھ اس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اتر رہا ہو تو وہ ان کی اطاعت کا مستحق ہے ورنہ عوام سے اس کا مطالبہ کرنے میں کسی طرح بھی حق بجانب نہیں۔ اس ضمن میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارِ خلافت سنبھالتے ہوئے جو بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ باب الرجل یخطب علی قوس

ایھا الناس فانی قد ولیتُ علیکم ولستُ بخیرکم فان احسنتُ فاعینونی وان اسأتُ فقوّمونی۔

لوگو! مَیں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر مَیں بھلائی کا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر مجھ سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کرو۔

عوام کے سامنے اپنی بشریت اور اس کے فطری تقاضوں اور غلطی کے سرزد ہونے کے امکانات کا اعتراف کرنے کے بعد پھر اُس معیار کا ذکر فرمایا جس کے مطابق انہیں اپنے سربراہوں کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔

اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ۔ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم[1]

جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب مَیں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت فرض نہیں رہتی۔

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام میں اللہ اور اُس کے رسول کے علاوہ کوئی ہستی اور ادارہ ایسا نہیں جو مکمل طور پر معصوم ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اس بنا پر اُس کی غیر مشروط اطاعت اور پیروی ہم پر لازم کی گئی ہو۔

اسلام کو اس معاملے میں تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت اور امتیاز حاصل ہے۔ یہ عقیدہ اُسے وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس عطا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہدایت کا سرچشمہ باری تعالیٰ کی ذات اور اس کا وہ مقدس رسول ہے جس کی وساطت سے اُس نے اس ہدایت کو نوعِ انسانی تک پہنچایا اور اُس کے عملی مضمرات اُس کی حیاتِ طیبہ سے واضح کیے۔ اس بنا پر مسلم قوم کی عقیدت و محبت کا مستقل مرکز و محور صرف اللہ اور اس کے رسول ہیں۔ باقی سب

---

[1] حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸

عقیدتیں اس ایک عقیدت کے تابع ہیں۔

دنیا کی دوسری اقوام میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جسے اس معاملے میں مسلمانوں کی ہمسری حاصل ہو۔ اُن کے ہاں ہمیں بے شمار ایسے ادارے ملتے ہیں جنہیں وہ ہر نقص سے پاک سمجھتے ہیں۔ فلسفۂ مذہب کے ماہرین نے اس اختلاف کی جو وجہ بتائی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے حاملِ وحی کی تصریحات اور اس کی توجیہات کو پوری طرح محفوظ کر رکھا ہو اس لیے الہام ربانی کی فکری اور نظری توضیح اس کے مختلف پہلوؤں کی تشریح اور اُن کی عملی تعبیر کے لیے انہیں بعض شخصیتوں اور اداروں کو عصمت کا وہ مقام دینا پڑا جس پر درحقیقت انبیاء علیہم السلام فائز ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ان بزرگ ہستیوں یا ان مقدس اداروں کی تصریحات ہر خطا سے بالکل پاک اور منزہ نہیں ہو سکتیں اور ان میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے تو پھر خود کلامِ الٰہی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ احکامِ الٰہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان کی عملی دقتوں کو صحیح طور پر حل کرنے کے لیے اور ان کے مختلف گوشوں کی وضاحت اور صراحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود باری تعالیٰ کا رسول اُس کے حکم کے تحت اور اُس کی نگرانی میں ان سارے مراحل میں انسان کی رہنمائی کرے تاکہ اُسے اس امر کا پورا طرح اطمینان ہو کہ وہ منشا الٰہی کو عین اس کی ہدایت کے مطابق پورا کر رہا ہے۔

جن مذاہب میں لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ یہ منصب دوسرے افراد اور اداروں کو سونپا وہ فطری طور پر اس بات کے لیے مجبور رہتے کہ ان افراد اور اداروں کے فیصلوں کو بھی ہر خطا، لغزش اور کمزوری سے اُسی طرح محفوظ و مامون سمجھیں جس طرح کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں کیونکہ جب تک ایک انسان کے دل و دماغ میں یہ بات پوری طرح پیوست نہیں ہو جاتی کہ وہ تعلیمات ربانی کو اُسی انداز سے اپنا رہا ہے جس کی باری تعالیٰ نے خود نشاندہی کی ہے اس وقت تک اُسے روحانی تسکین نصیب نہیں ہو سکتی۔ مذہب کی پیروی کسی قانون کی پیروی نہیں جسے انسان بالجبر کرنے پر مجبور ہو۔ مذہب کا تعلق ظاہری قوانین سے کہیں زیادہ دلی کیفیات سے ہے اس لیے انسان

مذہبی دائرہ میں جو کچھ کرتا ہے وہ برضا و رغبت کرتا ہے، اور اسے بڑے مقدس جذبات اور پاکیزہ احساسات کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ تعلیمات ربانی کے عملی پہلوؤں کو بھی اتنا ہی پاک، مقدس، ہر خطا اور عیب سے پاک اور منزّہ سمجھے جتنا کہ کتاب اللہ کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں جب کلامِ الٰہی کے سمجھنے اور اُسے حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی واضح اور مستند ہدایات حاصل نہ کرسکیں تو انہوں نے دوسری شخصیتوں اور اداروں کے فیصلوں کو منزل من اللہ سمجھ کر انہیں مذہبی عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا۔

تاریخ کے اوراق ان قوموں کے ان غلط فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بعض افراد نے مشاہدۂ باطن کرنے والوں کو نبوت کے مقام پر فائز کرکے اُن کی ہر بات کو جُوں کا توں قبول کیا، بعض نے حکمرانوں اور طاقتور لوگوں کو کلامِ الٰہی کا شارح اور ترجمان سمجھا اور اُن کی اس طرح غیر مشروط اطاعت کی جس طرح خدا کا بندہ اللہ اور اُس کے رسول کی کرتا ہے۔ بعض نے حکومت اور اس کے سربراہوں کے بارے میں یہ غلط تاثرات قائم کیے کہ ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن ہے۔ مسلمانوں کے ہاں مرکزِ ملت کی عصمت کا جو تصور پیش کیا جارہا ہے وہ بھی اسی غلط نظریہ کا شاخسانہ ہے۔

معصومیت کا تاج یُوں تو مختلف حالات اور مختلف ادوار میں مختلف طبقوں اور اداروں کے سر پر رکھا جاتا رہا ہے لیکن ہم یہاں صرف کلیسا اور اربابِ کلیسا کے بارے میں چند چیزیں پیش کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے ہاں کلیسا کا پُورا نظام اس بنیاد پر قائم ہے کہ روح مقدس (HOLY SPIRIT) کو اپنے اظہار کے لیے پیکرِ محسوس درکار ہے اور یہ پیکرِ محسوس صرف کلیسا اور اس کے ارباب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا درحقیقت وہ لباسِ مجاز ہے جس میں روحِ مقدس جلوہ گر ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب رُوح ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے منزّہ ہے تو جو نظام اس کا مظہر ہے وہ بھی لازمی طور پر پاکیزہ اور منزّہ ہوگا۔ اس نظام کی جو تشریح

ڈارول سٹون نے DARWELL STONE ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS میں کی ہے وہ قابلِ غور ہے:

نظامِ کلیسا ایسے زندہ افراد سے عبارت ہے جن میں سے ہر فرد روح مقدس کا حریم ہے[1]۔" پھر اس نظام کی تقدیس زمان و مکان اور افراد سے وابستہ نہیں بلکہ یہ مستقل اور قائم بالذات ہے۔ اہلِ کلیسا کے گناہ ان کی پاکیزگی کو قطعاً متاثر نہیں کر سکتے[2]۔

اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ اس دائرۃ المعارف میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ آخر کلیسا اور اربابِ کلیسا کو معصوم اور منزہ تسلیم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ اسے چند صفحات میں سمیٹا نہیں جا سکتا مگر اس کا اساسی تصور وہی ہے جس کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کر دیا کہ تعلیمات الٰہی کو جب تک کوئی ہادئ برحق عمل کے سانچوں میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا اس وقت تک اُن کے سارے گوشے پوری طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ تعلیماتِ الٰہی کی تقدیس برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کی عملی تعبیر کا فرض بھی وہی فرد یا ادارہ سرانجام دے جو منشاء الٰہی کا پوری طرح رازداں ہونے کی وجہ سے اُسے خالق اور مالک کی مرضی کے عین مطابق اور اُس کی رہنمائی میں پوری واضح کر سکتا ہو اور پھر اپنے عمل سے اس کے عملی پہلو بنی نوع انسان کے ذہن نشین کرا سکے۔ اس امر کی وضاحت ایک عیسائی فاضل کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:۔

"کلیسا ایک زندہ ادارہ ہے جو پوری دنیا کی مسیحیت کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے اور افراد کے ایمان کی نشو و نما کرتا اور اُسے قوت و توانائی فراہم کرتا ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS VOL. III. P. 124

[2] ایضاً۔ P. 125.

اسی کے ذریعہ نوع انسانی پر کتاب مقدس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ اور وہ منعم حقیقی کی رحمتوں اور نوازشوں سے مستفید ہوتی ہے۔ اگر کلیسا بائبل کی تعلیمات کی عملی توضیح کا فرض سرانجام نہ دے تو یہ کتابوں کے صفحات میں ہی بکھری پڑی رہیں اور کوئی انہیں اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش نہ کرے۔ بائبل کی حقیقی افادیت اس وقت سامنے آتی ہے جب کلیسا کا زندہ نظام اس کی تصدیق کرے اور پھر کتاب مقدس کے عملی پہلوؤں کی مستند اور صحیح تعبیر پیش کر کے نوع انسانی کو دنیائے عمل میں انہیں اپنانے کی دعوت دے[1]۔"

کلیسا کی عمارت بلاشبہ اینٹ پتھر اور گارے سے تعمیر ہوتی ہے لیکن اس کے نظام کو تو بہرحال انسان ہی چلاتے ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت میں اُن سے خطا اور غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے۔ اب جبکہ کلیسا کے نظام کو ہر اعتبار سے صحیح، برحق اور ہر قسم کی غلطی سے پاک مان لیا گیا تو اس کے بعد اہلِ کلیسا کی عصمت کو تسلیم کرنا بھی نہایت ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے نظامِ کلیسا کو ہر خطا سے پاک اور منزہ سمجھا گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ نظام اُسی صورت میں سو فیصدی صحیح اور درست رہ سکتا ہے جب باری تعالیٰ خود اس کے چلانے کا انتظام کرے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہے خداوند قدوس خود انہیں ہر قسم کی لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ رکھے۔ اس نظام کے بارے میں جب تک لوگوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا نہ ہو جاتا کہ وہ نظام رضائے خداوندی کے عین مطابق چل رہا ہے اور باری تعالیٰ کی نگرانی میں اُس روحانی مقصد کو پورا کر رہا ہے جو تخلیقِ کائنات کی غایتِ اولیٰ ہے، اس وقت تک انسان اُس طمانیتِ قلب سے لذت آشنا نہ ہو سکتا تھا جو ایمان کا نہایت قیمتی بلکہ لازمی جزو ہے۔ عقیدہ مذہب کی جان اور اس کا جوہرِ حیات ہے۔ یہی چیز

---

[1] ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS VOL. VIII. P. 264. INFALLIBILITY

انسان کو مذہب کے روحانی اور اخلاقی نظام کے بارے میں وہ سکون خاطر عطا کرتی ہے جس کی اساس مادی نفع و نقصان کے بجائے ایک آن دیکھی ذات کی رضا اور خوشنودی پر ہوتی ہے۔ پھر اسی عقیدہ سے اُس کے ہاتھ ایمان و ایقان کی وہ لازوال دولت ہاتھ آتی ہے جو آنکھوں سے مستور اور حواس سے ماوراء حقائق کے متعلق اُسے اطمینان عطا کرتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز کلیسا کی عمارت سے تو حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیے عوام کو اُن حضرات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جن پر اس نظامِ کلیسا کو چلانے کی براہِ راست ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ عوام نے ان لوگوں کو مقام رسالت پر فائز کر کے اُن کے ساتھ عقیدت و محبت کا وہ رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی جو انسان باری تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ کرتا ہے۔

مذہبی طبقوں کی معصومیت کا تصور یکایک پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس انداز پر سوچنا شروع کیا کہ پادری عام حالات میں گناہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں لیکن جب وہ نظام کلیسا کے نمائندے بن کر کوئی بات کریں تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ جب ایک معصوم ادارے کی نمائندگی کریں گے تو باری تعالیٰ انہیں لازمی طور پر ہر لغزش اور خطا سے محفوظ رکھے گا۔ اس ضمن میں ایک نامور پادری کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو اس نے لیڈی سالمن کو ۱۸۶۷ء میں تحریر کیا تھا۔

"مجھے بیلر مائن سے اس معاملے میں پورا پورا اتفاق ہے کہ خواہ پوپ مبرّا من الخطاء ہے یا نہیں لیکن اس کی بلا چون و چرا اطاعت ہم سب پر لازم ہے۔ اس کی نافرمانی سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ جن حقائق کی نشاندہی کرتا ہے جس قسم کی بشارتیں دیتا ہے اور جس نوعیت کی تنبیہات کرتا ہے اُن میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کے اندازِ فکر میں بھی جانبداری پائی جا سکتی ہے لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ بات مسلّم ہے کہ وہ جب کلیسا کے نمائندے

کی حیثیت سے گفتگو کرتا ہے تو اس کی زبان فیض ترجمان سے ہمارے آقا و مولا ارشاد فرماتے ہیں"۔[له]

اسلام اور عیسائیت میں یہ اختلاف بڑے دُور رس نتائج کا حامل رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ عیسائیت اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے یا تو مذہبی طبقوں کو رسل اور انبیاء کی طرح ہر خطا سے مبرا اور اُن کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو ارشادِ ربانی سمجھ کر تسلیم کیا یا پھر ان کی باتوں کو سرے سے ہی رد کر دیا اور انہیں تاریک خیالی، تنگ نظری تعصب اور جہالت کا پیکر خیال کیا۔ پھر روشن خیالوں اور مذہبی طبقوں کے درمیان ہم نہ صرف اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل دیکھتے ہیں بلکہ ان کے درمیان کشمکش اور سر پھٹول کا بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پاتے ہیں۔ عیسائیوں کے اندر جب بھی غور و فکر کی تحریک پیدا ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے مذہبی رہنماؤں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اُن کے اثرات کو زائل کرنے پر سارا زور صرف کیا۔

اسلام میں علماء اور فقہاء کی حیثیت عیسائیت کے ائمہ سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے علماء کو کبھی مبرا من الخطا نہیں سمجھا۔ اس بنا پر وہ ان کی تصریحات سے بڑے خلوص کے ساتھ اختلاف کرتے رہے۔ اور اس وقت تک انہیں تسلیم نہ کیا، جب تک کہ انہیں اس امر کا یقین نہیں ہو گیا کہ اُن حضرات کی آرا اللہ اور اس کے رسول کی سنت سے ماخوذ ہیں اور اسلام کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انہیں جہاں کہیں ان میں کوئی خامی نظر آئی، بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس کی نشاندہی کی اور بڑی آزادی کے ساتھ اُس پر گرفت کی۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طرزِ فکر کے اس اختلاف نے معاشرتی، معاشی

له ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS
VOL. VII. P. 270

اور سیاسی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشرتی طور پر مسلمانوں کے اندر کوئی ایسا مذہبی طبقہ پیدا نہ ہو سکا جسے دین کی اجارہ داری حاصل ہو۔ ہر شخص جس نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں وہ طبقۂ علما میں شمار ہونے لگا لیکن یہ مرتبہ اور مقام اُس کے لیے کوئی خصوصی مراعات کے حصول کا ذریعہ نہ بنا۔ وہ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ عوام اور علماء اس سے مسائل میں اختلاف کرتے، اس کی لغزشوں پر اُسے ٹوکتے، اس کی علمی تحقیقات میں جہاں کہیں انہیں کمزوری نظر آتی اس کا کھلے بندوں اظہار کرتے اور نہ صرف خود اُسے رد کر دیتے بلکہ دوسروں کو بھی اُسے قبول نہ کرنے کی تلقین کرتے۔

اسلامی معاشرے میں طبقۂ علماء کے ساتھ اس مساویانہ سلوک کی وجہ سے جمہوری اقدار کو استحکام نصیب ہُوا۔ یہاں اگر جمہوریت پامال ہوئی ہے تو اس کی وجہ علما نہیں بلکہ بادشاہ اور ملوک تھے جنہوں نے اپنے ناجائز تصرف کو قائم رکھنے کے لیے عوام کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالا۔ علما کی جو کچھ قدر و منزلت تھی وہ کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ باری تعالیٰ نے اُن کے طبقے کو کوئی خاص امتیازات اور حقوق دے رکھے تھے بلکہ اُن کی عزت و توقیر کا سارا دارومدار، عام مسلمانوں کی طرح، اُن کی نیکی، پرہیزگاری، خدا خوفی، دین سے گہری محبت اور تعلیمات الٰہی کے صحیح فہم پر تھا۔ اور ان میں سے کوئی خوبی بھی ایسی نہیں جو ان کے ایک خاص طبقہ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں حاصل ہو، بلکہ یہ وہ صفات ہیں جنہیں ہر شخص اپنے اندر پیدا کرنے کا پُورا پُورا حق و اختیار رکھتا تھا۔

اس تصور کی وجہ سے مسلم معاشرے میں علماء نے دین اور مذہب کے نام پر وہ لوٹ کھسوٹ بھی نہیں کی جس کے بڑے دردانگیز واقعات ہمیں دوسرے معاشروں میں ملتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں چونکہ طبقۂ علما معصوم ہونے کی وجہ سے کچھ آسمانی حقوق رکھتا تھا اس وجہ سے وہ معاشرے پر جس قسم کا جائز و ناجائز دباؤ ڈالنا چاہتا بڑی آسانی کے ساتھ ڈال لیتا۔ اور کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوتی۔ وہ لوگوں کو مغفرت کے پروانے

دیتا اور اُن کے ہاتھ جنت کے قبالے بیچتا۔ اُن پر ہر طرح کے ظالمانہ محصولات عائد کرتا۔ مسلم سوسائٹی اس نوعیت کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ یہاں اگر بعض جاہل اور دنیا پرست گدی نشینوں نے اس طرح کی مذموم حرکات کیں تو انہیں برملا ٹوکا گیا اور علمائے حق نے حق پسندوں کی پوری تائید کے ساتھ اُن کی اِن خلافِ دین کارروائیوں پر گرفت کی اور ان کے اِن ناجائز ذرائع سے کمائے ہوئے مال کو اکلِ حرام قرار دیا۔

پھر سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر عدل و مساوات کے جو احساسات و تصورات پائے جاتے ہیں ان کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کام کر رہا ہے کہ معصوم صرف نبی کی ذات ہے، دوسرے ہر بشر سے غلطی کا صدور ممکن ہے۔ حضور سرورِ کائنات کے بعد جو کوئی اپنی بات منوانا چاہتا ہے وہ اس کے لیے دلائل پیش کرے اور ثابت کرے کہ اُس کی یہ بات اللہ اور رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ کوئی شخص اب اپنی کسی تصریح و توجیہ کو الہامی یا منزل من اللہ کہہ کر تسلیم نہیں کروا سکتا۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان اس باب میں کتنا اختلاف موجود ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جب جمہوری رجحانات نے زور پکڑا تو انہیں مذہب کو خیرباد کہنا پڑا۔ کیونکہ کسی معاشرے میں جمہوری اقتدار اور حقوقِ آسمانی رکھنے والے طبقے بیک وقت پنپ نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں جمہوریت اور دین کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اُن کے ذہن اس تصور سے کبھی خالی نہیں ہوئے کہ اب کوئی شخص اپنی بات کو وحی اور الہام کہہ کر عوام سے بلاچون وچرا اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اُسے اب دوسرے ابنائے جنس کی طرح اپنی بات کو قرآن و سنت کے ترازو میں تول کر پیش کرنا ہوگا اور لوگ اسی کے مطابق اس کا وزن متعین کر کے اُسے رد و قبول کریں گے۔

افریقیہ میں اسلام کا ماضی

از جناب خلیل حامدی صاحب

[اس مضمون کی محرک ایک تازہ کتاب ہے جو "تذکرۂ افریقیہ" کے نام سے بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے لکھی ہے اور جو در حقیقت موصوف کے اسفارِ افریقیہ کی دلچسپ اور دلفگار رُوداد ہے۔ افریقیہ کے مختلف ملک جب آزاد ہوئے تو پاکستان کی طرف سے ان ملکوں[1] کے جشن ہائے آزادی میں شرکت اور ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لیے ایک وفد سنہ ۶۶ء میں بھیجا گیا تھا۔ بریگیڈیر صاحب اسی وفد کے رُکن تھے، اور تذکرۂ افریقیہ اسی سفر کے مشاہدات و تاثرات کی یادداشت ہے۔ اس رُوداد میں انہوں نے تقریباً ۲۶ افریقی ممالک کے حالات کو کئی پہلوؤں سے اُجاگر کیا ہے جن میں سے بعض پہلو خود اہلِ پاکستان کے لیے نہ صرف دلچسپ اور معلومات افزا ہیں بلکہ انتہائی قابلِ غور بھی۔ خاص طور پر انہوں نے بڑی ژرف نگاہی اور نکتہ رسی سے افریقی مسلمان کے اُن حالات و مسائل کا جائزہ لیا ہے جن سے وہ آج دوچار ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ ان صفحات میں اس کتاب کی ان معلومات کو مختلف عنوانات کے تحت مرتب کریں جن سے افریقی مسلمان کی موجودہ حالت ہمارے ملک کے لوگوں کو معلوم ہو سکے۔ لیکن اس سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک نظر افریقی ممالک کے ماضی پر بھی ڈال لی جائے تاکہ دنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جن اقوام کو آج جاہل، پسماندہ اور ناتراش بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور جن کے ضعف و اضمحلال کی داستان سن کر سخت صدمہ

[1] مثلاً نیجر، داہومی، ٹوگو، اپر وولٹا، مالی، سینی گال، موریتانیہ، گینی، گامبیا، سیرالیون، لائبیریا، آئیوری کوسٹ، گھانا اور نائیجیریا وغیرہ۔

لاحق ہوتا ہے وہ ماضی میں کیا کارنامے انجام دے چکی ہیں اور افریقہ کی تاریخ تمدن میں انہوں نے کتنے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ خیال تو یہ تھا کہ پورے سیاہ افریقہ کے ماضی سے مختصراً تعارف کرایا جاتا مگر عجلت کی وجہ سے صرف مغربی افریقہ کو اس تعارف کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے اسی سے وسطی افریقہ اور مشرقی و جنوبی افریقہ کا قیاس کیا جا سکتا ہے]

امیر شکیب ارسلان نے مغربی افریقہ میں اشاعتِ اسلام کے تین مراحل بیان کیے ہیں۔ ہم انہی کی تقسیم کے مطابق ان تینوں مرحلوں میں اسلام کی داستانِ اثر و نفوذ بیان کریں گے۔ امیر شکیب ارسلان کے بیان کے مطابق پہلا مرحلہ سنہ ۶۴۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۱۰۰ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں شمالی افریقہ فتح ہوا، اور ان علاقوں میں اسلام نے قدم رکھے جن کے حدود بحر متوسط سے سوڈان تک تھے۔

سیاہ افریقہ میں دعوتِ اسلامی کا پہلا دور: مصر فتح کرنے کے بعد لشکرِ اسلام نے برقہ اور طرابلس کا رخ کیا۔ نامور صحابی حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ اس اسلامی فوج کے قائد تھے جو شمالی افریقہ میں داخل ہو رہی تھی۔ حضرت عقبہ نے قیروان (موجودہ تونس) کی بنیاد ۵۰ھ میں ڈالی اور اسے فوجی چھاؤنی بنایا۔ پھر وہاں سے مراکش کی جانب بڑھے اور طنجہ تک پہنچے۔ وہاں کے صنہاجہ قبائل حلقہ بگوش اسلام ہو گئے جن کی وجہ سے ریف کے علاقے میں اشاعت اسلام کی کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ پھر سوس کی جانب رخ کیا اور بربروں کے طاقتور قبیلہ مصامدہ کو زیرنگیں کیا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عقبہ بحرِ اطلانتک کے ساحلی شہر نول تک گئے اور اہل اللثام (منہ کو ڈھانک کر رکھنے والے)، قبائل سے مڈبھیڑ ہوئی اور بالآخر انہیں اسلامی حکومت کے تابع کیا۔ بعض مؤرخین، جن میں ٹمبکٹو کے مشہور عالم شیخ احمد بابا صاحب: "الکشف والبیان" بھی ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ حضرت عقبہ سیاہ افریقہ (بلاد سوڈان)، میں داخل ہوئے اور تکرور (مالی اور اپر وولٹا)، اور غانہ (گھانا)، کو فتح کیا[1]۔ اور وہاں متعدد

[1] حاشیہ صفحہ ۵۵ پر دیکھیں

مسجدیں بنوائیں۔ سنہ ۶۰ھ میں ان علاقوں میں مسلمان آبادیوں کا وجود ملتا ہے۔ بہر حال یہ بات متفق علیہ ہے کہ عقبہ وہ پہلے مسلمان فاتح ہیں جنہوں نے اہلِ شام بربروں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ اور مغرب کے دور دراز علاقوں تک پہنچے۔ اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سوڈان کے شمالی کنارے پر واقع تاریخی شہر اُودگشت کا راستہ کھولا اور اس کے بعد شمالی افریقہ کے تاجروں کے قافلے صحراء کو عبور کرتے ہوئے اس شہر کی تجارتی سرگرمیوں میں حصہ دار ہونے لگے۔

حضرت عقبہ ان علاقوں سے واپس ہو رہے تھے کہ شہید کر دیئے گئے۔ اسلام نے ابھی ابھی یہاں قدم رکھے تھے اس لیے نومسلم بربری قبائل مرتد ہو گئے۔ ان کی فہمائش کے لیے حضرت زُہیر بن قیس مقرر ہوئے۔ انہوں نے زعیم بربر کُسیلہ کو شکست دی اور طنجہ تک اُس کا تعاقب کرتے ہوئے اُسے قتل کر دیا۔ زہیر کے بعد حَسّان بن نعمان آئے۔ یہ اپنے پیشروؤں کی بہ نسبت فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت و اشاعت کے زیادہ حریص تھے۔ انہوں نے رومی قبائل کو شکست دی۔ عرب اور بربروں میں مساوات قائم کی۔ اور عربی زبان میں سرکاری محکموں کی تدوین کی۔

حضرت مُوسیٰ بن نُصَیر کے ہاتھوں اسلامی فتوحات کا نئے سرے سے آغاز ہوا۔ انہوں نے لشکرِ اسلام کے ہمراہ اُنہی راستوں کو اختیار کیا جن کو حضرت عُقبہ نے اختیار کیا تھا۔ سبتہ اور سوس تک پہنچے۔ بحرِ اطلانتک کے کنارے سے وضو کیا۔ وادیٔ دَرعا میں داخل ہو گئے اور مرتد قبائل کو دوبارہ آشنائے اسلام کیا۔ موسیٰ، حضرت عقبہ سے زیادہ دور اندیش تھے۔ وہ صرف ایک فوجی قائد ہی نہیں تھے بلکہ مصلح اور سیاست دان بھی تھے۔ انہوں نے بربروں کو اپنے قریب کیا۔

لہ بلکہ نائیجیریا کے مؤرخ شیخ عبداللہ فودی نے اپنی کتاب "تزیین الورقات" میں یہاں تک لکھا ہے "حضرت عقبہ مغربی افریقہ آئے۔ قبائلِ روم سے ملے۔ ان قبائل کا بادشاہ جس کا نام برمندانہ تھا مسلمان ہو گیا۔ حضرت عقبہ نے برمندانہ کی لڑکی سے شادی کی جس سے چار اولادیں ہوئیں۔ فولانی قبائل جن کا مسکن فوتا، سینیگال اور گینیا ہے اُنہی کی نسل سے ہیں"

اسلامی حکومت کی محبت اُن کے دل میں ڈالی اور ملکی نظم ونسق میں انہیں شریک کیا۔ مسجدیں بنوائیں اور عوام الناس کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا انتظام کیا۔ نقاب پوش قبائل سے ملے جو صحرائے اعظم میں سوڈان کی شمالی حدود تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت پیش کی۔ اغمات میں مسجد تعمیر کروائی جو مراکش میں اسلامی تہذیب کی اشاعت کا مرکز بن گئی اور اس کی نور افگن کرنیں مغربی افریقیہ کے در و بام کو نئی صبح سے آشنا کر رہی ہیں۔

موسیٰ بن نُصَیر کے جانشین بھی ان کے نقشِ قدم پر چلے۔ اور بربروں کے اندر دعوت وتبلیغ کے کام کو جاری رکھا۔ اسماعیل بن عبداللہ بن ابوالمہاجر جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی طرف سے افریقیہ کے گورنر بنائے گئے تھے انہوں نے مراکش میں دعوتِ اسلامی کی توسیع میں اس حد تک دلچسپی لی کہ ان کے عہدِ حکومت میں وہاں کوئی ایسا بربر قبیلہ نہ رہا جو اسلام کے دامنِ رحمت میں پناہ نہ لے چکا ہو[۱]۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسماعیل بن عبداللہ کے ساتھ فقہائے تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت روانہ کر دی جو مفتوحہ علاقوں میں پھیل گئی۔ یہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے، اسلام قبول کرنے والوں کو احکامِ دین کی تعلیم دیتے، حدود قائم کرتے، منکرات ومحرمات کا سدِباب کرتے اور مفاسد کی بیخ کنی کرتے تھے۔

دوسرا دَور: اسلامی مملکتوں کا قیام | یہ مرحلہ ۱۷۱ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۰۵۰ء تک ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں شروع کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں اشاعتِ اسلام کی رفتار بہت سُست ہو گئی۔ خلیفۂ بغداد کے نفوذ سے جب بعض ریاستوں نے علیحدگی اختیار کی تو شمالی افریقیہ کے مغربی حصّے میں بھی مقامی مسلمان حکمرانوں میں خود مختاری کا رجحان پیدا ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی کئی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں زیادہ طاقتور ادریسی حکومت تھی جو ادریس بن عبداللہ علوی کی زیرِ قیادت (۱۷۲ھ) قائم ہوئی۔ ادریسی حکومت نے دو بڑے کام کیے۔ ایک مراکش کو علوی امراء کی قیادت میں متحد کرنے کی کوشش۔ اس کوشش کے نتیجے میں میدانی علاقے کی آبادیاں اور

[۱] ابن عبدالحکیم: فتوح مصر وافریقیہ ص ۱۰۶

صحرائی آبادیاں یکجا ہوگئیں۔ اور دوسرے مراکش کے تمام علاقوں میں صحرائے اعظم کی آخری حد تک اسلام کی اشاعت، باطل عقاید کی بیخ کنی اور عیسائیت و یہودیت کے باقیماندہ اثرات کو محو کرنے کے لیے تحریکِ جہاد کا آغاز۔ اسی زمانے میں ادریسیوں نے فاس کی بنیاد ڈالی جہاں متعدد علمی مدرسے وجود میں آگئے اور اُن کے اثرات دُور دراز قبائل تک پہنچنے لگے۔ اُدھر اندلس میں انہوں نے مسلمانوں کے اقتدار کو مضبوط تر کر دیا۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین اسی عہد کی شخصیت ہے۔ اندلس میں ان کی کامیابیوں کی بدولت چار صدیوں تک وہاں اسلام کا غلغلہ بلند رہا۔ موسیٰ بن نُصَیر کے عہد میں بھی اندلس کے فاتحین میں اکثریت شمالی افریقہ کے بربروں کی تھی اور یوسف بن تاشفین کے لشکر میں بھی جانباز قبائل شریک تھے[1]۔ ادریسیوں کے عہد میں دو زبردست قبیلے اسلام میں داخل ہوئے: ایک لَمْتُونَہ اور دوسرے جُدالہ۔ یہ دونوں قبائل صنہاجہ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلام میں داخل ہونے سے مسلمانوں کی شوکت و قوت میں غیر معمولی اضافہ ہُوا اور سیاہ قبائل نے جوق در جوق اسلام کو قبول کرنا شروع کر دیا۔

دریائے سینیگال کے طاس اور صحرائے اعظم کے علاقوں میں دعوتِ اسلامی کی تحریک کا اصل زور گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا۔ ابن ابی زرع کا بیان ہے کہ "قبیلہ جُدالہ (صنہاجہ کی ایک شاخ) کے سرخیل یحییٰ بن ابراہیم تقویٰ و تفقہ فی الدین میں مشہور تھے۔ یہ جب حج سے واپس آئے تو انہیں ایک ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جو ان کے قبیلے کو تعلیم دین سے بہرہ ور کرے چنانچہ عبداللہ بن یٰسین نے ان کی ضرورت کو پورا کیا"۔[2]

عبداللہ بن یاسین نے بربروں میں جو احکامِ دین پر توجہ نہ دے رہے تھے، دعوتِ اسلامی کا

---

[1] یہی وجہ ہے کہ عیسائی اقوام نے لفظ بربر کو دنیا کے اندر بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی ہے اور اس کے معنی میں ظلم و درندگی کا تصور پیدا کیا۔ اس کوشش کی کامیابی کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمان بھی جب ظلم و ستم کی انتہا بیان کرنا چاہیں گے تو اسے "بربریت" کی اصطلاح سے موسوم کریں گے۔ ان کو یہ احساس نہیں کہ دراصل یہ ایک گالی ہے جو یورپ والوں نے مسلمان بربروں کے لیے وضع کی تھی۔ [2] الانیس المطرب ج ۲ ص ۱۱ و ۱۲ مطبوعہ رباط

کام شروع کر دیا اور خاص طور پر ان کی اخلاقی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر دریائے سینی گال کے ایک جزیرہ میں اپنا مرکز دعوت قائم کر لیا۔ وہاں ایک رباط تعمیر کی جو عبادت گاہ بھی تھی اور دین کی تعلیم و تربیت اور اخلاقی و اجتماعی اصلاح کا مرکز بھی۔ بربر کے قبائل جُدالہ، لمتونہ اور مسوفہ میں سے عبداللہ کو ایک ہزار کارکن ایسے دستیاب ہو گئے جن کی انہوں نے پوری طرح تعلیم و تربیت کی اور پھر انہیں مغربی افریقیہ کے ممالک میں دعوتِ اسلامی کے لیے روانہ کیا۔ ابن ابی زرع کا بیان ہے کہ عبداللہ بن یاسین نے اپنے شاگردوں کو کارِ دعوت پر روانہ کرتے وقت کہا:

"اللہ کے نام پر آپ لوگ نکل کھڑے ہوں، اپنی قوموں کو تبلیغ کریں، خدا کے عذاب سے انہیں ڈرائیں، اور اسلام کی حجت ان پر تمام کریں۔ اگر وہ توبہ کریں اور حق کی طرف رجوع کریں اور نافرمانیوں سے باز آجائیں تو ان سے کوئی تعرض نہ کریں۔ لیکن اگر وہ انحراف کا راستہ اختیار کریں اور گمراہی و سرکشی میں مزید اتر جائیں تو ہم ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں گے اور ان سے جہاد کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ فرما دے۔"

عبداللہ بن یاسین نے خود بھی صحراء کے آخری کناروں تک سفر کیا اور صنہاجہ قبائل میں اسلامی تعلیم کو فروغ دیا اور بالآخر بورغواطہ کے کافروں سے لڑتے ہوئے ۴۵۹ھ میں شہید ہو گئے۔ کریفلہ مقام پر ان کی قبر بنی ہوئی ہے۔

ان لوگوں نے دعوت و جہاد میں جو کارنامے سرانجام دیئے، اور صبر و استقلال کے جو جوہر دکھائے ان کی بنا پر انہیں "مُرابطین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ شمالی اور مغربی اور وسط افریقیہ میں مُرابطین کی تحریک نے دعوتِ اسلامی کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اور جب بربر امیر ابوبکر بن عمر نے اپنے چچا زاد بھائی یوسف بن تاشفین کو مراکش کا حاکم مقرر کیا تو انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت مرابطی حکومت کی داغ بیل ڈالی جو تاریخ میں دولت مرابطین

کے نام سے مشہور ہوئی۔ دولت مرابطیہ نے نہ صرف اندلس کی وادیوں میں اسلام کا سکہ رواں کیا بلکہ افریقہ کے بیشتر حصوں کو بھی اسلام کی بہار جانفزا سے لطف اندوز کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ نامور مجاہد یوسف بن تاشفین شہر مراکش کے بانی (۱۰۶۲ء) مرابطی حکومت کے دوسرے سربراہ تھے، ان کا دور اس لحاظ سے امتیازی شان رکھتا ہے کہ سیاہ افریقہ کی خلقِ کثیر فوج در فوج نعمت اسلام سے مالامال ہوئی۔

۱۰۷۶ء میں بربر مجاہدین اور مبلغین گھانا کے علاقوں میں اُتر گئے۔ گھانا کے حکمرانوں سے تصادم ہوا۔ مگر یہ حکمران دعوتِ اسلامی کے سیلاب کے سامنے نہ ٹک سکے۔ بربر گھانا پر قابض ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھانہ کی پوری آبادی اسلام میں داخل ہو گئی۔ اسی سال مرابطین کی کوشش سے مغربی افریقہ کے وسیع الاثر فولانی قبائل مسلمان ہو گئے۔ یہ قبائل ان علاقوں میں آباد تھے جو آج سینی گال، فرنچ سوڈان (یعنی گایون، چاڈ، وسط افریقہ جس کا قدیم نام اُبنگی شاری تھا، اور بالائی کانگو)، نیجر اور نائیجیریا کے ناموں سے مشہور ہیں۔ فولانی قبائل کے مسلمان ہو جانے سے پورا مغربی افریقہ اور صحرائے اعظم اذانوں سے گونج اٹھا[1] اور اس کے بعد سیاہ افریقہ کے مغربی حصوں میں پے در پے کئی اسلامی مملکتیں وجود میں آگئیں[2] جن میں سے بعض کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

موحدین کی حکومت کے بانی محمد بن عبداللہ بن تومرت نے بھی فقیہ ملتونہ عبداللہ بن یسین مرابطی کے طریقۂ دعوت و تجدید کو اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن ہرغہ میں رباط قائم کی، اپنے تلامذہ اور متبعین کی تنظیم کی اور دعوت و جہاد کی طرح ڈالی۔ اُن کی اُن کوششوں کے نتیجے میں بارھویں صدی عیسوی میں وہ عظیم الشان حکومت وجود میں آئی جو افریقہ کی تاریخ میں موحدین کی حکومت سے یاد کی جاتی ہے۔ اس حکومت کی بنیاد خالص توحید پر قائم تھی۔ اس حکومت نے امر بالمعروف اور

[1] الاسلام فی نائیجیریا، تالیف آدم عبداللہ الالوری النائیجیری ص ۱۵، مطبوعہ مصر

[2] تاریخ الدولۃ الفاطمیہ ص ۳۰۲، مطبوعہ القاہرہ، تالیف حسن ابراہیم حسن۔

نہی عن المنکر کا نظام جاری کیا۔ خود محمد بن عبداللہ بن تومرت نے عقیدۂ توحید کے موضوع پر بربری زبان میں متعدد کتابیں تالیف کیں اور انہیں اپنے شاگردوں اور رضاکاروں کے ذریعہ مسلمان آبادیوں اور قبائل میں پھیلایا۔ صاحب الاستبصار کا بیان ہے: "موحدین کی کوششوں سے توحید خالص کی دعوت مشرق میں طرابلس اور مغرب میں گھانا، اور افریقہ کے قلب تک پھیل گئی۔"

یہ ہے اُن کوششوں کا اجمالی تذکرہ جو دَورِ ثانی میں اشاعتِ اسلام کے باب میں صرف کی گئیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں مغربی اور وسطی افریقہ میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکتیں وجود میں آگئیں، جنہوں نے اسلام کی اشاعت، تہذیب و تمدن کے فروغ اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان مملکتوں میں سے بعض کا ہم ذیل میں تعارف کراتے ہیں۔

مملکتِ غانہ وسطی افریقہ اور مغربی افریقہ میں سوڈانی اقوام کی جتنی مملکتیں قائم ہوئی ہیں اُن میں قدیم ترین مملکتِ غانہ (گھانا) ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں اس مملکت پر سوننکی قوم حکمران تھی جو سوڈانی اقوام کی ایک شاخ تھی۔ اس وقت اس مملکت کی حدود مشرق میں ٹمبکٹو تک، جنوب مشرق میں دریائے نیجر کے دھانوں تک، جنوب اور جنوب مغرب میں سینی گال کے منبع تک اور مغرب میں تکرور (جس کی حدود سینی گال کے شمال سے لے کر فوتا یعنی موجودہ گینیا تک تھیں) پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ مملکت مراکشی قبائل کی آبادیوں کے جنوب میں قائم تھی۔ اس مملکت میں سونے کے ذخائر بکثرت موجود تھے اور مراکش اور مغربی یورپ تک سونا برآمد کیا جاتا تھا۔ غانہ کی اس تجارت کا آفاق میں شہرہ تھا۔ اسی بنا پر شمالی افریقہ سے مسلمانوں کی کثیر تعداد یہاں آکر آباد ہوگئی اور یہاں کاروبار اور ملازمت کرنے لگی۔ بلکہ مسلمانوں نے شہر غانہ کے کچھ فاصلے پر اپنا مستقل شہر تعمیر کرلیا، جس کی عمارات پتھر کی تھیں جبکہ سوڈانی غانہ مٹی اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں سے عبارت تھا۔ فقیہ ملتونہ عبداللہ بن یاسین نے جب سینی گال میں مرابطی دعوت کا آغاز کیا، تو اس کے اثرات غانہ تک بھی پہنچے۔ اس کے بعد مرابطی حکمرانوں نے غانہ کو فتح کرنے کی متعدد کوششیں کیں مگر ۱۰۷۶ء میں مشہور مرابطی لیڈر ابوبکر بن

عمر کے ہاتھوں یہ مملکت شکست کھا گئی۔ اور جب ابوبکر بن عمر نے اپنے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین کو جانشین بنایا تو یوسف بن تاشفین نے مراکش اور اندلس کی فتوحات کے ساتھ سونکی کی مملکت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور وہاں اسلامی حکومت کا پرچم لہرا دیا۔

تقویم البلدان میں غانہ کے ضمن میں مذکور ہے کہ اس کے دو شہر ہیں۔ ایک مسلمانوں کا اور دوسرا کفار کا۔ شریف ادریسی نے غانہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے: "ملال اور غانہ بحر شیریں (یعنی دریائے نیجر) کے کنارے دو شہر ہیں۔ غانہ رقبہ کے لحاظ سے سوڈان (یعنی نیگرو اقوام) کا سب سے بڑا ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی سب سے مقدم ہے۔ اس کی تجارت بھی دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اردگرد ممالک سے خوشحال تاجر یہاں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کے باشندے مسلمان ہیں۔ بادشاہ کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت حسن بن علی کی نسل سے ہے۔ اس کا نسب یہ ہے: صالح بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ خطبہ اسی کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ لیکن وہ خلیفہ عباسی کے زیر اطاعت ہے۔ دریائے نیجر کے کنارے اُس کا قصر ہے جس کی عمارت نہایت پائدار اور مستحکم ہے۔ کمرے نقش و نگار اور رنگ و روغن سے مزین ہیں۔ بلور کی قندیلیں آویزاں ہیں۔ یہ قصر سنہ ۵۱۰ھ میں تعمیر کیا گیا۔"[1]

نیز شریف ادریسی نے لکھا ہے: دریائے نیجر میں ایک جزیرہ ہے جو شہر غانہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کی لمبائی ۳ سو میل اور چوڑائی ۲ سو میل ہے۔ اگست کے مہینے میں جب سیلابوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے اور پانی اُتر جاتا ہے تو لوگ سونے کے ٹکڑوں کی تلاش میں جزیرہ کی جانب نکل جاتے ہیں۔ اور ہر انسان کم یا زیادہ جو کچھ اللہ نے اس کی قسمت میں لکھا ہے، سونا لے آتا ہے۔ یہ لوگ اس کی تجارت کرتے ہیں۔ سونے کے ٹکڑوں کو ٹکسال گھروں میں لے جاتے ہیں اور انہیں دیناروں میں ڈھالتے ہیں اور پھر کاروبار پر لگاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر سال اختیار کیا جاتا ہے۔[2]

---

[1] نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق ص ۶

[2] ایضاً ص ۸

ناصری السلاوی نے مقامات حریری کے شارح ابو العباس احمد الشریشی کے حوالے سے لکھا ہے: مراکش کے تاجر بنی بذرار کے شہر سجلماسہ میں جمع ہوتے ہیں اور پھر قافلوں کی صورت میں غانہ کا سفر کرتے ہیں۔ جاتے وقت یہ مسافت وہ تین ماہ میں طے کرتے ہیں اور واپسی پر ڈیڑھ ماہ میں۔ اپنے ساتھ جو مال و متاع لے کر جاتے ہیں اُسے سونے کے ٹکڑوں کے عوض وہاں فروخت کرتے ہیں۔ مراکشی تاجر اگر تیس اونٹ غانہ لے کر جائے گا تو اُن میں سے صرف تین یا دو اونٹ واپس لائے گا۔ ایک اونٹ سواری کے لیے اور دوسرا پانی لادنے کے لیے۔ تاجر تیس اونٹوں کا سامان بیچ کر جو سونا خریدتا ہے وہ ایک اونٹ کا بوجھ ہوتا ہے[1]۔"

اس مختصر بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غانہ کی اسلامی مملکت نہایت مالدار تھی۔ عوام الناس بڑے خوشحال تھے۔ سونے کے ذخائر کی وجہ سے اس مملکت میں تجارت عروج پر تھی۔ یورپ تک سے تاجر یہاں پہنچتے تھے۔ اس لحاظ سے غانہ کا تاجر بیرونی تہذیبوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ غانہ میں غیر ملکی سامان کی درآمد کثرت سے تھی۔ تجارت پیشہ قوم عقلی و ذہنی اور تمدنی لحاظ سے جن خوبیوں سے بہرہ ور ہوتی ہے وہ سب ان میں پائی جاتی تھیں۔

مملکت مالی | اس مملکت کے مشرق میں برنُو (چاڈ)، مغرب میں بحر اطلانتک[2] شمال میں جبل بربر تھا۔ یہ مملکت "سیاہ افریقہ" کی سب سے بڑی اسلامی مملکت شمار ہوتی تھی۔ اس کے پانچ صوبے تھے جن میں سے ہر صوبہ مستقل مملکت تھا اور کنفیڈریشن کی شکل میں صوبہ مالی کے تحت تھا۔ ان صوبوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ صوبہ مالی۔ یہ صوبہ باقی صوبوں کے وسط میں تھا۔ اسے مرکزی حکومت کی حیثیت حاصل

---

[1] الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ ج ۵ ص ۹۹ — ۱۰۰

[2] عوام الناس اسے "بلاد تکرور" کہتے تھے۔ اور تکرور ن بن گیا۔ سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ان علاقوں کے باشندوں کو آج بھی تکرونی کہا جاتا ہے۔

[3] اس کا قدیم نام بحرِ ظلمات ہے۔

تھی۔ اس کا دارالحکومت نِیَنی تھا۔ موجودہ مالی ریاست تقریباً وہی علاقہ ہے جہاں پہلے صوبہ مالی تھا۔

۲۔ صوبہ صوصو۔ یہ مالی کے مغرب میں تھا

۳۔ صوبہ غانہ۔ یہ صوصو کے مغرب میں تھا۔ اور بحر اطلانتک تک اس کی حدیں ملتی تھیں۔ یہاں سونے کی کانیں تھیں، مراکش کے تاجر سجلماسہ (موجودہ تافیلات) کے راستے سے صحراء کو عبور کرتے ہوئے یہاں پہنچتے تھے۔ صوبہ غانہ کے لوگ حضرت عقبہ بن نافع کے عہد میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

۴۔ صوبہ کوکو۔ یہ صوبہ مالی کے مشرق میں تھا۔ اس کا دارالحکومت کوکو تھا۔ اس کے اور غانا کے درمیان ڈیڑھ ماہ کی مسافت تھی۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں اب نیجر ہے۔

۵۔ صوبہ تکرور۔ یہ کوکو کے مشرق میں تھا۔ اس کا دارالحکومت تکرور تھا۔ عوام اونی لباس پہنتے تھے اور خواص روئی کا لباس۔ ان کی خوراک مکئی، دودھ اور مچھلی تھی۔ مراکش کے تاجر سیسہ، تانبا اور ریشم لے کر جاتے تھے اور سونے کے ٹکڑے لاتے تھے[۱]

گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں کانگابا (KANGABA) کے سلاطین جو مینڈگو قوم سے تعلق رکھتے تھے مسلمان ہو گئے۔ سب سے پہلا مسلمان حکمران برمندانہ تھا۔ اس نے اسلام لانے کے بعد حج کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں انہوں نے جنوب اور جنوب مشرق میں اپنی مملکت کی حدود کو توسیع دینی شروع کی۔ ۱۲۳۰ء میں سلطان سانڈیاٹا نے اس مملکت کو مالی جیسی عظیم الشان مملکت میں تبدیل کر دیا۔ مینڈگو کو فولانی زبان میں مالی کہتے ہیں۔ اور بربری میں ملت (MELIT) اس کے بعد سلطان سنڈیاٹا نے مملکت گھانا پر ۱۲۴۰ء میں قبضہ کر لیا اور نیانی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ سلطان سنڈیاٹا اگرچہ اس کے بعد لڑائیوں میں شریک نہیں ہوا مگر اس کی فوجوں نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے جانشین منسا اولی[۲]

---

[۱] القلقشندی: صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۲۸۲

[۲] منسا فولانی زبان میں سلطان کو کہتے ہیں۔ منسا اولی یعنی سلطان اول۔

(۱۲۵۵ء-۱۲۷۰ء) کے عہد میں انہوں نے بامبوک (باماکو) اور بندو پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲۷۰ء اور ۱۳۰۷ء کے درمیان سات بادشاہ حکمران ہوئے جن میں سکوٹا (۱۲۸۵-۱۳۰۰ء) سب سے مشہور تھا۔

منسا موسیٰ (۱۳۰۷ء-۱۳۳۲ء) کا عہد مملکت مالی کے عروج و ترقی کا عہد ہے۔ اس عہد میں مالی کی اسلامی سلطنت میں غیر معمولی توسیع ہوئی اور مشرق میں ڈنڈی سے لے کر مغرب میں تکرور تک اور صحرائے اعظم کے آخری شہر ولاتہ سے لے کر جنوب میں فوتا جالون (گینیا) تک اس کی حدیں پھیل گئیں۔ پورے مغربی اور وسطی افریقہ میں سوائے تجارتی شہر جنی (JENNE) اور آزاد مملکت مُستی (MOSSI) کے کوئی علاقہ ایسا نہ رہا جو اسلامی سلطنت کا حصہ نہ بن چکا ہو۔ مراکش، برقہ اور مصر سے قافلے آتے اور مالی کی زیارت کرتے۔ منسا موسیٰ کے تمام اسلاف حج بیت اللہ سے مشرف ہوتے رہے ہیں۔ منسا موسیٰ نے جب حج کیا تو اس کا چرچا پوری اسلامی دنیا تک پھیل گیا۔ یہ سفر اس نے ۱۳۲۴ء میں کیا ہے۔ موسیٰ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ حاشیہ میں ۵ سو غلام تھے۔ ہر غلام کے ہاتھ میں سونے کا ایک عصا تھا جس کا وزن ۵۰۰ مثقال تھا۔ اس کے علاوہ ۸۰ سے زائد اونٹ سونے سے لدے ہوئے تھے، جن میں سے ہر ایک پر تین قنطار سونا تھا۔ راستہ بھر موسیٰ سونے کی بارش کرتا گیا۔ قاہرہ میں خوب داد و دہش کی۔ اس وقت سلطان الناصر محمد بن قلاوون کی حکومت تھی (ابن خلدون)۔ حرمین میں بھی اُس نے خوب سونا لٹایا۔ والی مصر کے حاجب ابن امیر کے بیان کے مطابق واپسی پر موسیٰ کو مصر کے تاجروں سے قرض لینا پڑا۔ اسی سفر میں واپسی پر اپنے ساتھ علماء اور ماہرین کی ایک جماعت کو ساتھ لیا جنہوں نے مالی اور ٹمبکٹو میں اپنے مرکز قائم کیے۔ ان میں ایک معمار ابو اسحاق الساحلی تھا جو غرناطہ کا رہنے والا تھا۔ اسی معمار نے منسا موسیٰ کا محل تعمیر کیا اور گاؤ (GAO) اور ٹمبکٹو (TOMBOUCTOW) میں عالیشان مسجدیں بنائیں۔ مغربی افریقہ کے فنِ تعمیر میں پختہ اینٹ کا استعمال سب سے پہلے اسی معمار نے رائج کیا۔[1]

[1] FAGE. HISTORY OF WEST AFRICA PP. 24-26

ابن بطوطہ نے منسا موسیٰ کی داد و دہش کے بارے میں لکھا ہے :

" اُس نے ایک ہی دن میں ابو اسحاق الساحلی کو ۴ ہزار مثقال سونا دیا اور دوسروں کو تین ہزار مثقال۔ ملسان کے ایک شخص نے منسا موسیٰ کو بچپن میں ۱/۲ ۷ مثقال سونا دیا تھا۔ موسیٰ کے سلطان بن جانے کے بعد یہ شخص اُس کے پاس آیا۔ موسیٰ نے اسے پہچان لیا اور امراء سے دریافت کیا : "ایسے شخص کی نیکی کا کیا بدلہ ہے ؟" امراء نے کہا : "ایک نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے"۔ مگر موسیٰ نے اُسے سات سو مثقال سونا ، اور خلعت ، اور خدم و حشم کی ایک جماعت عطا کی "۔

ابن بطوطہ نے ۷۵۳ھ میں مالی مملکت کی سیاحت کی ہے جبکہ منسا سیلمان سریر آرائے حکومت تھا۔ ابن بطوطہ منسا سلیمان کے دربار میں گیا اور اعیانِ حکومت اور فقہاء اور علماء سے ملاقات کی۔ منسا سلیمان نے ابن بطوطہ کو خصوصی مہمان خانہ میں ٹھہرایا۔ جب رمضان کی ۲۷ تاریخ آئی تو منسا سلیمان نے شہر کے قاضی، خطیب اور فقہاء کو بہت اموال دیئے۔ ابنِ بطوطہ کو بھی ۱/۲ ۳۳ مثقال سونا دیا۔ ابن بطوطہ روانہ ہونے لگا تو مزید ایک سو مثقال سونا دیا[1]۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں منسا بادشاہ کے محل اور دربار کی کیفیت کو بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے : عید کے روز لوگ سفید لباس پہن کر نکلے۔ سروں پر سبز رنگ کا نقاب تھا۔ قصرِ شاہی سے متصل عید گاہ میں جمع ہوئے۔ بادشاہ جب نماز کے لیے آیا تو تکبیر و تہلیل کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔ خطبہ اور نماز کے بعد خطیب بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور فضائلِ عید بیان کیے۔ اُسی روز حسبِ معمول سلطان عصر کے بعد دربار میں آکر بیٹھا۔ شعراء نے قصائد پڑھے جن میں سابق حکمرانوں کی شجاعت اور جود و سخا اور عدل و انصاف کے قصّے بیان کیے گئے[2]۔

ابنِ بطوطہ کا مزید بیان ہے :

" مالی کے لوگ عدل و انصاف میں مشہور ہیں۔ ملک کے اندر امن و امان کا دور دورہ ہے۔

---

[1] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۹۹ - ۲۰۰

[2] رحلۃ ابن بطوطہ : ج ۲ ص ۱۹۷ - ۱۹۸

کسی مسافر یا مقیم کو چور یا ڈاکو سے کوئی خطرہ نہیں۔ مراکش یا دوسری سفید فام آبادیوں میں سے آنے والا کوئی شخص اگر یہاں انتقال کر جائے تو اس کے اموال سے کوئی تعرض نہیں کرتا خواہ وہ انبار روں کے انبار کیوں نہ ہو۔ بلکہ لوگ اُسے قابلِ اعتماد ہاتھوں تک پہنچا دیتے ہیں تاکہ اُس کے حقدار کے حوالے کر دیا جائے۔ لوگ نماز کے بڑے پابند ہیں۔ نماز باجماعت کا غیر معمولی اہتمام ہے۔ بچے اگر نماز نہ پڑھیں تو انہیں مارتے ہیں۔ جمعہ کے روز اگر آدمی قبل از وقت مسجد میں نہ جائے تو اُسے جگہ نہیں ملتی، کیونکہ مسجدیں پوری طرح بھر جاتی ہیں۔ جمعہ کے روز لوگ سفید لباس پہنتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی پرانی قمیص ہو تو وہ اسے دھو کر اور صاف کر کے جمعہ میں شریک ہوگا۔ لوگوں میں قرآن مجید حفظ کرنے کا عظیم شوق و ولولہ پایا جاتا ہے۔ بچوں کو قرآن حفظ کراتے ہیں۔ اور اگر کوئی بچہ اس سے گریز کرے تو اسے سزا دیتے ہیں[1]۔"

قلقشندی نے لکھا ہے:

"اہلِ مالی میں جادو کا رواج ہے۔ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ جادو سے انسان قتل تک کر دیا جا سکتا ہے۔ سلطان جس طرح قاتل پر قصاص نافذ کرتا ہے اسی طرح جادوگر کو بھی موت کی سزا دیتا ہے۔ وہاں یہ رواج ہے کہ جو شخص بادشاہ کی مجلس میں چھینک مارے اُسے زدوکوب کرتے ہیں۔ اگر کسی کو چھینک آئے تو وہ زمین کی جانب جھک کر چھینک لیتا ہے۔ بادشاہ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں لکھتا بلکہ سکرٹریوں سے لکھواتا ہے۔ ملکی فوج کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ دس ہزار گھڑ سوار اور باقی پیادہ[2]۔"

سر ٹامس آرنلڈ کا بیان ملاحظہ ہو:

"مالی کے باشندے افریقہ کی نیگرو اقوام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ، مہذب اور ذہین تھے۔ صنعت و حرفت میں، امانتداری میں، بستیوں کی صفائی اور نظافت میں بے مثال تھے۔ اسلامی شریعت کے سخت پابند تھے[3]۔"

---

[1] رحلہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۰۰ [2] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۲۹۱-۲۹۰-۳۰۰ [3] الدعوۃ الی الاسلام (ترجمہ: دی پریچنگ آف اسلام)، ص ۲۷۵

منسا موسیٰ کے بعد مملکت مالی میں اضمحلال کا آغاز ہوگیا۔ اور اس کے بعض حصّے خود مختار ہو گئے۔ سولھویں صدی کے بعد یہ مملکت زوال پذیر ہو گئی۔ پرتگیزیوں نے ساحلی علاقہ پر اپنی کالونی بنالی۔ سترھویں صدی میں یہ مملکت سکڑ کر انہی حدوں میں محصور ہو گئی جن میں پہلے تھی[1]۔ مگر اس کے زوال کے ساتھ ہی ایک اور مملکت سنگھائی کو عروج نصیب ہوا۔

مملکت سنگھائی سنگھائی قوم کے کاشتکار دریائے نیجر کے کنارے آباد تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مراکشی بربروں نے ان پر حملہ کیا۔ اور ڈیا (DIA) خاندان کی حکومت قائم ہوئی جو ۱۳۳۵ء تک قائم رہی ان کا دارالحکومت کوکیا تھا جو موجودہ نائیجیریا کے شمال مغرب میں تھا۔ بعد میں یہ علاقہ مملکت مالی کا جزبن گیا۔ اس مملکت کے تجارتی تعلقات گھانا، تونس، برقہ اور مصر سے تھے۔ انہی تعلقات کی بدولت یہاں کے حکمران شمالی افریقہ کی دعوتی کوششوں سے متأثر ہو کر گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد سنگھائی کا صدر مقام دریائے نیجر کے کنارے گاؤ شہر میں منتقل کر دیا گیا جو تجارتی شاہراہوں پر واقع تھا۔ ۱۳۳۵ء میں جب مملکت مالی کو زوال ہوا تو ڈیا خاندان نے دوبارہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان کا لقب سُنّی تھا۔ اُس وقت اس مملکت کی حدیں وادی نیجر سے متجاوز نہ تھیں مگر سُنّی علی کے عہد (۱۴۶۴ء۔ ۱۴۹۲ء) میں اسے بڑی وسعت حاصل ہوئی۔ ۱۴۶۸ء میں اہلِ ٹمبکٹو نے بُت پرست قبائل کے مسلسل حملوں کے خلاف سُنّی علی سے فوجی کمک طلب کی۔ چنانچہ سُنّی علی نے بڑھ کر اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے پانچ سال بعد سنّی علی نے جنّی کے تجارتی شہر پر قبضہ کر لیا۔ سنّی علی سخت گیر حکمران تھا۔ اس کے عہد میں ٹمبکٹو کے علماء اور فقہاء ہجرت کر کے ولاتہ چلے گئے۔ سنّی علی کی وفات کے بعد سلطنت کی زمام کار فوج کے ایک افسر کو منتقل ہوئی جس کا تعلق سونکی قبیلہ سے تھا۔ اُس نے اپنا لقب اسکیا محمد الاوّل رکھا۔ یہ بڑا دیندار حکمران تھا۔ اس نے شہری نظم ونسق کو مستحکم کیا۔ فوجی نظام مضبوط کیا۔ اور تمام سرکاری ذرائع کو دین کی ترقی واشاعت پر صرف کیا۔ ۱۴۹۵ء میں اس نے سفرِ حج کیا۔ اُس کا یہ سفر داد و دہش اور شان و شکوہ میں منسا موسیٰ کے سفر سے بھی فزوں تر تھا۔

[1] FAGE - HISTORY OF WESTERN AFRIGA PP. 26-29.

اس کے عہد میں ٹمبکٹو میں اسلامی علوم و فنون کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ حج سے واپس آکر اسکیا محمد الاول نے ارد گرد کے علاقوں میں اشاعت اسلام کی زبردست مہم جاری کی۔ چنانچہ مغرب میں میڈنگو اور فولانی قبائل اور شمال میں بربر طوارق، جنوب میں مُستی اور مشرق میں ہوسا قبائل میں دعوتِ اسلامی کا زبردست چرچا ہو گیا۔ اس کے ساتھ سنگھائی کی حدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئیں۔ مُستی قبائل کی ریاستوں کے علاوہ کوئی ریاست بھی اسکیا محمد الاول کے سیلاب جہاد کے آگے نہ ٹھیر سکی سنگھائی میں شمال ریاستوں کی حدیں بلادتکرور تک اور شمال اور شمال مشرق میں بربری آبادیوں تغزہ اور اَجدیس تک پھیل گئیں۔ ہوسا کی آبادیاں بھی اسکیا کی باج گزار بن گئیں۔ گویا سنگھائی مملکت اس تمام علاقے کو محیط تھی جو سابق میں فرانسیسی مغربی افریقہ کہلاتا تھا اور جس کا رقبہ ۸ لاکھ مربع میل تھا۔ نیز اس میں تمام شمالی نائیجیریا اور اس کا صحرائی علاقہ شامل تھا۔ اسکیا محمد الاوّل کی حکومت اپنے زمانے کی نہایت ترقی یافتہ حکومت تھی۔ وہ خود بہت بڑا عالم تھا اور علوم و فنون کا قدردان تھا۔ ۱۵۲۸ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کے جانشین اسکیا اسحاق الاول (۱۵۳۹ء۔ ۱۵۴۹ء) نے بڑی کوششوں سے مملکت کو خلفشار سے بچایا۔ اسکیا اسحاق کے بعد داؤد کے ہاتھ میں زمامِ سلطنت آئی۔ اس نے بھی اپنے پیشروؤں کی طرح بُت پرست قبائل میں دعوتِ اسلامی کی مہم کو جاری رکھا۔ داؤد کی وفات (۱۵۸۲ء) کے بعد اندرونی خلفشار اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مملکت کو کمزور کرنے کا موجب بن گیا۔ سلطان مراکش احمد منصور ذہبی نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر سنگھائی پر لشکر کشی کی تاکہ سونے کی کانوں پر قبضہ کرے۔ مگر یہ لشکر کشی حکومتِ مراکش کے لیے مفید ثابت نہ ہوئی۔ ایک طرف حکومتِ مراکش کو اس مہم میں بہت بھاری مصارف ادا کرنے پڑے جو سونے کی کانوں سے پورے نہ ہو سکے، کیونکہ سونے کا نکاس اصل آمدنی نہ تھی بلکہ سونے کی تجارت اصل آمدنی تھی اور یہ تجارت ملکی امن و امان کی حالت ہی میں جاری رہ سکتی ہے۔ دوسری طرف مراکشی فوجیں سوڈانی علاقوں میں امن قائم کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ ملک میں جگہ جگہ فولانی، بمبارا اور طوارق نے شورشیں برپا کر دیں۔ یہ وہ دور تھا جبکہ یورپی اقوام مغربی افریقہ کے ساحل پر اُتر رہی تھیں۔ فوجی سرداروں نے بھی خود مختاری اختیار کر لی۔ بادشاہ مراکش اب صورتِ حال پر قابو نہ رکھ سکے اور آخر کار اقتدار مبارک کے حکام کی طرف منتقل ہو گیا۔

(باقی)

مطبُوعات

ضیاء القرآن جلد اوّل | از صاحبزادہ پیر محمد کرم شاہ صاحب بی، اے، فاضل جامع ازہر، مصر۔ سجادہ نشین بھیرہ۔

ناشر: چوہدری غلام رسول اینڈ سنز، تاجرانِ کتب اردو بازار۔ لاہور

قرآن مجید علم و حکمت کا ایک ایسا بحرِ ذخّار ہے جس کا کسی صورت بھی احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ رشد و ہدایت کا منبع ہونے کے علاوہ بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں علوم کا سرچشمہ ہے۔ جب سے یہ کتاب نازل ہوئی ہے مختلف ذوق اور مختلف صلاحیت رکھنے والے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں افراد نے اپنی استعداد اور رجحانِ طبع کے مطابق اس کے معانی اور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس بحرِ بیکراں کی وسعت اور گہرائی کا کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکا اسی وجہ سے ہر دَور میں اہلِ علم اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں غوّاصی کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

جناب صاحبزادہ پیر محمد کرم شاہ صاحب نے بھی خدمتِ قرآن کے نیک اور مقدس جذبے سے کتابِ الٰہی کا سلجھا ہوُا ترجمہ کیا ہے اور اس پر عمدہ حواشی لکھے ہیں۔ فاضل مترجم چونکہ سلسلۂ طریقت کے علمبردار ہیں اس لیے ان کی تصریحات میں تصوّف کا رنگ جھلکتا ہے۔ نحوی اور لغوی تحقیقات بڑی فاضلانہ ہیں اور جناب شاہ صاحب کی عربی زبان پر قدرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ شروع میں انہوں نے بڑے مختصر مگر جامع انداز میں جمع قرآن، ترتیب قرآن اور قرآن مجید کی تلاوت کے آداب پر بحث کی ہے۔ فہرست مطالب جس میں مضامین کے علاوہ الفاظ کی لغوی نحوی تحقیق بھی شامل ہے بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔

ناشران نے جلد اول کو جو سورۂ فاتحہ سے سورۂ توبہ پر مشتمل ہے بڑے سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، ہدیہ درج نہیں۔

اسلام اور جمہوریت | تالیف: جناب ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ۔ مقام اشاعت: مکتبہ نوائے وقت، کوئنز روڈ، لاہور۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے۔ صفحات ۱۶۸

اس کتاب کے مصنف اس ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر نوائے وقت میں بڑے متوازن اور فکر انگیز مقالات لکھتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۶۵ء تک کے مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان مضامین کا تعلق عصری سیاست سے ہے اور اس میں ملک صاحب نے اسلام اور جمہوریت کے نقطۂ نظر سے ملک کی سیاسی صورتِ حالات کا جائزہ لیا ہے۔

فاضل مصنف کی ہر رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن ان مضامین کو پڑھنے کے بعد غور و فکر کی نئی راہیں اور عمل کے نئے میدان ضرور سامنے آتے ہیں اور قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت اور صاحبِ دل شخص نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ملک صاحب کی تحریر سادہ اور اثر انگیز ہے۔ اور انہوں نے دلائل سے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔

کتاب کے آغاز میں پیش لفظ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور تعارف جناب چوہدری محمد علی صاحب نے لکھا ہے۔

الحزب المقبول من احادیث الرسول | مرتبہ: جناب ابو احمد صاحب۔ شائع کردہ علمی کتاب خانہ اردو بازار، لاہور۔

حضور سرورِ کائنات کی دعائیں اپنے اندر جو گہری معنویت اور غیر معمولی اثر انگیزی رکھتی

ہیں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان دعاؤں کو ذہن میں لا کر اور ان کے اثرات کو قلب پر وارد کر کے انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندہ مومن کو اپنے خالق اور مالک سے عبودیت اور بندگی کا رشتہ کس نہج اور کس احساس کے ساتھ استوار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کو یہ دعائیں زیادہ سے زیادہ پڑھنی چاہییں۔ ان دعاؤں کے کئی ایک مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

شروع میں فاضل مرتب نے احادیثِ نبوی کی روشنی میں دعا کی فضیلت، دعا کے آداب اور دعا کے قبول ہونے کے اوقات کی صراحت کی ہے۔ اس کتاب میں البتہ دو چیزیں کھٹکتی ہیں۔ ایک اس کا معیار طباعت و کتابت وہ نہیں جو اس نوعیت کی پاکیزہ اور مقدس کتابوں کا ہونا چاہیے۔ دوسرے عربی متن کی تصحیح کا پورا انتظام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اس میں کئی ایک اغلاط رہ گئی ہیں۔

کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ہدیہ دو روپے ہے۔

فضائلِ صحابہ و اہل بیت | از شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ف (۱۲۴۳ھ۔۱۸۲۴ء)
شائع کردہ: پاک اکیڈمی ۱/۱۴۱۔ وحید آباد کراچی۔ صفحات ۳۵۱ قیمت چھ روپے۔

کتاب علمی اعتبار سے جس پایہ کی ہے اس کے لیے تو صرف مصنف کا نام کافی ہے البتہ تعارف کے طور پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ کتاب فاضل مصنفؒ کے تین مشہور رسائل "سر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل"، "عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس"، "وسیلۃ النجاۃ" اور اُن کے اور شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مکتوبات پر مشتمل ہے۔ ان رسائل میں سے پہلا رسالہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ کے تتمہ کے طور پر تحریر فرمایا تھا اور اس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت ثابت کی ہے۔ اس کا ترجمہ جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے کیا ہے۔ دوسرے رسالے میں شاہ صاحب نے خلفائے اربعہ اور اہلِ بیت کی فضیلت میں ساری احادیث

کو جمع کر دیا ہے۔ تیسرے رسالے میں حضرت شاہ صاحب نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ فرقہ ناجیہ اہلِ سنت ہی ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں قرآن سے دلائل فراہم کیے ہیں اور صحابہ کرام کے مرتبۂ مقام کو بڑے مؤثر انداز میں بیان فرمایا ہے۔

شروع میں جناب محمد ایوب قادری ایم۔ اے نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کی پاکیزہ زندگی کے مستند حالات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب اہلِ علم کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ہے۔

ترجمان القرآن کے پُرانے پرچے

مجھے اپنی فائل کی تکمیل کے لیے ترجمان القرآن کے مندرجۂ ذیل پرچے مطلوب ہیں۔ براہِ کرم اگر کوئی صاحب قیمتاً یہ پرچے مہیا کر سکیں تو بیحد ممنون ہونگا۔

جلد ۴۱ عدد ۱-۵-۶　　جلد ۴۷ عدد ۱-۲-۳-۴-۵　　جلد ۶۳ عدد ۳

جلد ۴۵ عدد ۲-۳-۴-۵　　جلد ۴۸ عدد ۱　　مندرجۂ ذیل پتہ پر

جلد ۴۶ 〃 ۱-۳-۵-۶　　جلد ۵۷ - عدد ۴　　اطلاع دیں:

محمد صدیق کاتبِ ترجمان القرآن۔ طارق سٹریٹ چاہ میراں خورد۔ لاہور

ضروری تصحیح

پچھلے ماہ کے ترجمان القرآن میں میری کتاب "حیاتِ فخر" پر تبصرہ میں کتاب کے ملنے کا پتہ جو دیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ کتاب کاشانۂ ادب کچہری روڈ لاہور یا میرے ہاں "فخر منزل - ۱۰۰ اڈی ماڈل ٹاؤن لاہور" سے بقیمت ۵ روپے مل سکتی ہے۔

(بقیہ اشارات)

محض ایک فریب ہے۔" (نوائے وقت - ۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء)

اسی نظری اور فکری اختلاف کی بنیاد پر انہوں نے متحدہ حزب اختلاف میں نیشنل عوامی پارٹی کی شمولیت کو خارج از امکان قرار دیا۔"

ان حالات میں ہم بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کا مقصد اور منہاج صاف طور پر بیان کر دیں۔ ہمارا مقصد ابتدا سے یہ رہا ہے اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کہ ہم تمام دنیا میں، اور ابتدائی مرحلے کے طور پر اس ملک میں وہ نظام نافذ کریں جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو دیا ہے، اور مسلمان ہوتے ہوئے کسی دوسرے نظام کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھنا ہمارے نزدیک ارتداد ہے۔ ہمارے نزدیک مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے، اور یہی ہماری جدوجہد کا مقصود ہے کہ سب سے پہلے ہم خود مالک الملک کی بندگی اختیار کریں اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کو اُسی رب العزۃ کی بندگی اختیار کرنے کی تلقین کریں اور اس راہ میں جو مزاحمت بھی درپیش ہو اُسے تدبر اور حوصلہ مندی سے دور کرنے کی کوشش کریں۔ ہم خدا کی بندگی کے سوا انسان کے لیے کسی دوسری بندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے خواہ وہ پتھر کے بتوں کی ہو، قوم اور وطن کی ہو، رنگ و نسل کی ہو، احبار و رہبان کی ہو، بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی ہو، یا دنیا کے خود ساختہ رہنماؤں کی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ سروری زیبا فقط اُسی ذاتِ بے ہمتا کو ہے۔ اس کے سوا جتنے بھی معبود ہیں وہ سب معبودانِ باطل ہیں ہم انہیں بفضلِ ایزدی توڑنے کا عزم رکھتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں فلاح و کامرانی کا معیار بھی کچھ دوسرا ہے۔ ہم ہر اُس ظاہری فلاح کو سراسر خسران سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے بجائے کسی دوسرے نظام کی پیروی میں حاصل ہو۔ ہمارے نزدیک صرف آخرت ہی میں نہیں، اس دنیا میں بھی وہ حقیقی اور پائدار فلاح نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی خوشنما اور نظر فریب ہو۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین حاصل ہے کہ فلاح صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ

کی پیروی میں ہے۔ کسی فرد، کسی قوم اور پوری انسانیت کو اس راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے وہ نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ برعظیم ہندو پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں نے اپنی جان و مال اور آبرو کو اس لیے خطرے میں نہیں ڈالا تھا کہ یہاں کوئی روسی، چینی یا امریکی نظام نافذ ہو۔ اور آج بھی اس ملک کی عظیم اکثریت اسلام کے سوا کسی دوسرے نظام کا نام سننے کی بھی روادار نہیں ہے۔ یہاں اسلام کے عملی نفاذ کے راستے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان میں سے بیشتر یہاں کی ایک نہایت معمولی اقلیت نے جسے کچھ تاریخی اسباب سے یہاں نفوذ و اثر حاصل ہے، اپنے ذاتی رجحانات یا مفادات کی خاطر پیدا کی ہیں۔ ہم باری تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کر کے اس ملک میں وہ نظام نافذ کرنے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں جو برحق بھی ہے، دنیا اور آخرت کی فلاح کا ضامن بھی ہے، اور خود اس جمہوریت کا تقاضا بھی ہے جسے ماننے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں، کیونکہ ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسی کو چاہتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم نے آمریت کی جگہ جمہوریت کو لانے کے لیے ملک کی دوسری جماعتوں کے ساتھ آج تک بھی تعاون کیا ہے اور آئندہ بھی کریں گے لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم کسی لادینی، یا مغربی یا مشرقی طرز کی جمہوریت کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کے لیے کسی سے تعاون کر رہے ہیں۔ ہمارا اس تعاون کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم پُر امن آئینی طریقوں سے اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب جمہوری طریقوں سے قیادت کو تبدیل کرنے کے سارے راستے کھلے رہیں۔ جمہوریت اصل مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اصل مقصد نہیں۔ ہمارا اصل مقصد اسلام ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام ہمارے نزدیک باطل ہے خواہ وہ سرمایہ داری ہو، فاشزم ہو، یا اشتراکیت یا اشتمالیت۔